ماہنامہ

پیامِ عمل

لاہور

انیس نمبر



یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ



میر خلیق (میر انیس کے والد)



میر نفیس (فرزند میر انیس)



سلامت علی دبیر (میر انیس کے جلیل القدر ہمعصر)



میر حسن (میر انیس کے دادا)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہو جو نیکی کی طرف بلائے۔ اچھی باتوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے (کلام قرآن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان میں ملتِ جعفریہ کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا

جلد ۱۶
شمارہ ۱۱-۱۲

ذی الحجہ ۱۳۹۲ ہجری، محرم ۱۳۹۳ ہجری، جنوری فروری ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

پیامِ عمل

لاہور

کا

انیس نمبر

سرپرست اعزازی: مولانا سید محمد جعفر زیدی خطیب جامع مسجد اسلام پورہ لاہور۔ نگران: جسٹس سید جمیل حسین رضوی
مدیر اعزازی: پروفیسر سید کوثر حسین ایم۔ اے

پیامِ عمل کا آئندہ شمارہ

پیامِ عمل کا آئندہ شمارہ "اربعین نمبر" ہوگا۔ جو انشاء اللہ اپریل کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔ چونکہ وہ مارچ اور اپریل کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس لئے قارئین مارچ کے پیامِ عمل کا انتظار نہ فرمائیں۔ (مدیر)

انیس نمبر کی نایابی

زرِ کثیر صرف کرنے کے باوجود ہم "انیس نمبر" کثیر تعداد میں شائع نہیں کر سکے۔ اسلئے پیامِ عمل کے خریدار حضرات پوری احتیاط سے کام لیں اور ڈاک سے رسالہ نہ ملنے کی صورت میں ڈاکخانہ سے رجوع فرمائیں۔

مینجنگ ٹرسٹی خواجہ حبیب علی پی۔ سی۔ ایس۔ ۶، چیپل روڈ ــــ لاہور۔ فون نمبر ۵۴۵۵۴

بدلِ اشتراک

ممبران ــــــ سات روپے سالانہ ، معاونین ــــــ دس روپے سالانہ

مربی (لائف ممبر)

یکصد روپیہ یکمشت یا قسط وار بشرطیکہ پہلی قسط مبلغ بیس روپے کی ہو اور بقایا رقم ایک سال کے اندر ادا ہو۔

سرپرست

پانچ سو روپیہ یکمشت یا قسط وار بشرطیکہ پہلی قسط مبلغ یکصد روپیہ ہو اور بقایا رقم ایک سال کے اندر ادا ہو۔

بیرونِ پاکستان کے لئے فیس رکنیت

سرپرست :- ۵۰ پونڈ، عمر بھر کے لئے ایک مرتبہ۔	مربی (لائف ممبر) :- ۱۰ پونڈ، عمر بھر کے لئے ایک مرتبہ
معاون :- ۲۵ شلنگ سالانہ	ممبر :- ایک پونڈ سالانہ
فی پرچہ :- ۷۵ پیسے	انیس نمبر :- تین روپیہ

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۵ ۱۷ انارکلی لاہور

گزارش

جن حضرات کا خریداری نمبر درج ذیل ہے صرف ان سے

آپ کا خریداری نمبر ــــــــــــ ہے

آپ کا چندہ ماہ فروری ۱۹۸۲ء میں ختم ہو گیا ہے۔

آخری پرچہ بھیجا جا رہا ہے۔ اس ماہ کے ختم ہونے سے پہلے آپ اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے۔ اسطرح آپ وی پی کے اخراجات بھی بچ جائیں گے اور پیامِ عمل کا اگلا شمارہ "اربعین نمبر" جو ایک ضخیم اور یادگار شمارہ ہوگا، آپ بلا قیمت حاصل کر سکیں گے بشرطیکہ آپ اپنا سالانہ چندہ جلد ارسال فرمائیں یا اپنا ممبری نمبر ضرور لکھئے

اس شمارے میں

اداریہ — مدیر — ۶

مقام انیس — نجم آفندی — ۱۱

پہلے اغلاط درست فرما لیجئے

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۸	۸	سیکرٹری	لرسٹی
۲۳	۸ (نیچے سے)	بیٹھے تھے	بیٹھتے تھے
۳۳	۱۰	ناداری کا با طعنہ	ناداری کا یا طعنہ
۳۷	۱۲	میں لیڑی	میں بڑی
۶۱	۴ (نیچے سے)	کس نمازی	کسی نمازی
۶۳	۷ (نیچے سے)	توشا لوش	نوشا نوش
۶۸	۱۲	سلاست روی	سلاست روی
۸۳	۷ (نیچے سے)	قدر نہیں جاتی	قدر نہیں جاتی
۸۵	۴	قدریں کسی کو سلک نہیں	قدریں کسی کی سلک نہیں
۸۶	۸	جو صاحب لوبت ہے	جو صاحب نوبت ہیں
۹۲	۱۳	الیس نے	انیس
۹۳	۱۴	ننھی سے	ننھی سی
۱۰۱	۸ (نیچے سے)	جز عمل	جز عمل خیر

تضمین بر سلام انیس — سید محمود الحسن نیرنگ — ۷۲

انیس کے مراثی رزمیہ شاعری کا مستقل سانچا ہے — پروفیسر سید وقار عظیم — ۷۵

کلام انیس — مولانا سید محمد جعفر — ۷۹

کلام انیس میں مدح اخلاق — سید یوسف حسین شائق — ۸۳

بدلِ اشتراک

ممبران - دس روپے سالانہ

یک صد روپیہ یکمشت کے اندر ادا ہو ۱۰۰

پانچ سو روپیہ یکمشت کے اندر ادا ہو

سرپرست

معاون

فی پرچہ

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۱۰۳	۲ (حاشیہ نیچے سے)	زبان کی قوت	زبان کو قوت
۱۰۴	۸ (نیچے سے)	صبر و اضا	صبر و رضا
۱۰۶	۵ (نیچے سے)	علیم	علیہم
۱۰۸	۳ (نیچے سے)	ھتھیا	ھتھیار
۱۱۲	۸	اضغر	اصغر
۱۲۲	۷	واقفیت	واقعیت
	۹ (نیچے سے)	اھتمام حجت	اتمام حجت
۱۲۳	۸	سوار تھا	پہاڑ تھا
۱۲۶	۱۱	تعطل	تعقل
۱۲۸	۳ (نیچے سے)	کلام غالب کے کلام کی جان ان کا جال و ایجاز تین ہمعصر نام اور شعرا انھیں سے	کلام غالب کی جان ان کا اجمال و ایجاز ہے تین ہمعصر نام آور شعراء میں سے

جن حضرات کا خریداری نمبر ــــ ہے

گزارش

آپ کا خریداری نمبر ــــــــــ ہے

آپ کا چندہ ماہ فروری ۱۹۸۳ء میں ختم ہوگیا ہے۔

آخری پرچہ بھیجا جا رہا ہے۔ اس ماہ کے ختم ہونے سے پہلے آپ اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے۔ اسطرح آپ وی۔پی کے اخراجات بھی بچ جائینگے اور پیام عمل کا اگلا شمارہ "اربعین نمبر" جو ایک ضخیم اور یادگار شمارہ ہوگا، آپ بلاقیمت حاصل کرسکیں گے بشرطیکہ آپ اپنا سالانہ چندہ جلد ارسال فرمائیں۔ اپنا ممبری نمبر ضرور لکھئے

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	۰
مقامِ انیس	نجم آفندی	۱۱
میر انیس	اعجاز رحمانی	۱۲
انیس نکتہ سنج	عشرت لکھنوی	۱۳
انیس	حسین اعظمی	۱۵
یادِ انیس	کبیر انور جعفری	۱۶
میر انیس	رفیق رضوی	۱۷
میر انیس اور ان کی مجالس مرثیہ خوانی	سید امجد علی اشہری	۱۹
میر مستحسن خلیق	سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی	۲۶
مرثیہ میر خلیق	〃	۳۲
انیس کا غم	ڈاکٹر سید عبداللہ	۳۸
انیس یعنی مرثیہ	سید نصیر امام نصیر	۴۱
میر انیس کا موت اور قبر سے پیار	انور سدید	۴۸
انیس کے مرثیے میں شہر	انتظار حسین	۵۴
رباعیات انیس	پروفیسر یوسف جمال انصاری	۵۹
میر انیس کی منظر نگاری کے چند نادر نمونے	سرشار صدیقی	۶۵
انیس کی زمین شعر ہے ادب کا آسماں	ذاہد محمد قاسم	۶۹
تضمین بر سلام انیس	تجمس اعجازی	۷۰
تضمین بر سلام انیس	سید محمود الحسن نیرنگ	۷۲
انیس کے مراثی رزمی شاعری کا مستقل سانچا ہے	پروفیسر سید قادر عظیم	۷۵
کلام انیس	مولانا سید محمد جعفر	۷۹
کلام انیس میں مذہب اخلاق	سید یوسف حسین شائق	۸۳

انیس کی مرقع نگاری	ڈاکٹر محمد اسلام	۹۱
سلام انیس	کسریٰ منہاس	۹۹
انیس بحیثیت ماہر نفسیات	ڈاکٹر عالیہ امام	۱۰۳
میر انیس کی رزمیہ کیفیات	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۱۰
انیس کے ایک مرثیہ کا تجزیہ	باقر زیدی	۱۱۹
تین معاصر، غالب، دبیر، انیس	سید محمد امیر امام حر	۱۲۳
از کلام خدائے سخن میر انیس	سید سردار مہدی رضوی	۱۳۰
تذکرہ خانوادۂ میر انیس	سید اصغر حسین اصغر آل انیس	۱۴۱
ناصر رسالت و امامت	پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری	۱۴۹
یوم انیس	پروفیسر شہر عباس نقوی	۱۵۵
میر انیس کی صد سالہ برسی	ضمیر اختر نقوی	۱۶۴

اخبار غم

• سلطان الذاکرین سید آغا حسین (بھکر) نے رحلت فرمائی۔ • سیدہ امۃ الزہرا ہیڈ مسٹرس گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کراچی جو بسلسلۂ حج ڈھائی ماہ سے حرمین شریفین میں مقیم تھیں۔ رہگرائے ملک بقا ہو کر مکہ معظمہ میں مدفون ہوئیں مرحومہ سید مشتاق حسین نقوی چیف آرگنائزنگ سیکرٹری پاکستان شیعہ مطالبات کمیٹی کی حقیقی بہن تھیں۔ قارئین کرام سے سورہ فاتحہ کی درخواست ہے۔

اداریہ

پیامِ عمل کا "انیس نمبر" اس وقت منظرِ عام پر آرہا ہے جب موسمِ عزا کی آمد آمد ہے اور دلِ رسول کی صفِ ماتم بچھانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ محرم کا چاند نظر آنے گا تو در و دیوار سے "ہائے حسین" کی صدائیں بلند ہوں گی۔ ہوا کا ہر جھونکا نالہ و شیون کی خبر لائے گا اور ہر بستی میں ماتم کی صدائے بازگشت سنائی دیگی۔ اس طرح یاد منانا اور رسمِ عزا بجالانا بتا رہا ہے کہ عالمِ انسانیت کو امام حسینؑ سے کتنی عقیدت ہے ؎

جو حسینؑ پر گزری وہ جفا نہ بھولیں گے
بھول جائیں گے سب کچھ کربلا نہ بھولیں گے
(نجم آفندی)

کربلا کا سانحۂ کبریٰ کوئی معمولی یا شخصی واقعہ نہیں ہے جو فراموش ہو سکے۔ یہ اسلام کی اصل حقیقت سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں شریعتِ اسلامیہ کے بہت سے حقائق و اسرار مضمر ہیں۔ آج نہ صرف مسلمانوں کے نزدیک بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کے نزدیک واقعۂ کربلا ایک عدیم النظیر واقعہ ہے جس میں احیاءِ حق کی خاطر اپنی اور اپنے خاندان کی بربادی کو بطیبِ خاطر قبول کر لیا گیا۔

یہی واقعہ اردو کے شاعرِ اعظم میر انیسؒ کا موضوعِ سخن ہے۔ ان کے اجداد و امجاد بھی ممتاز شاعر ہو گزرے ہیں۔ لیکن میر انیسؔ کو قدرت نے بطورِ خاص ایسا نوازا کہ وہ ایک نابغۂ روزگار اور سرآمدِ شعرا کی حیثیت سے ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے اقلیمِ سخن پر چھا گئے۔ ان کی مرثیہ نگاری جو اس وقت شاعری کی ایک جامع صنف ہے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ان کے ادبی و فنی معجزات میں تہذیبِ اخلاق اور اصلاحِ کردار کا ساز و سامان بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ایسی ہستیوں کے مرقعے پیش کرتے ہیں جن میں دین داری و حق گزاری رچ بس گئی تھی۔ یہ جیتے جاگتے مرقعے بڑی خوبی سے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا کام انجام دیتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر نصرتِ حق کی آرزو پنپتی ہے، زندگی کا مفہوم نکھر کر سامنے آتا ہے اور کربلا والوں کا ساتھ دینے کی تمنا دل میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔

میر انیسؔ نے مرثیے کے رائج الوقت خاکے میں رنگ بھرے۔ منظر کشی اور جذبات نگاری کا کمال دکھایا، رزمیہ شاعری کا آغاز کیا اور مرثیے میں ڈرامائی عناصر داخل کئے جس نے مرثیہ کو ایک انوکھی صنفِ سخن بنا دیا۔ ان کے اس کارنامے میں خوبیٔ زبان، قدرتِ کلام اور نفسیاتی رکھ رکھاؤ کو بھی بڑا دخل ہے۔

"انیس نمبر" میں ملک کے نہایت ممتاز اہلِ قلم نے اظہارِ خیال کیا ہے جسے پڑھ کر میر انیسؔ اور ان کے فن کی عظمت کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے، اور یہی اس اشاعت کا اصل مقصد ہے۔

انیس نمبر کی تکمیل میں مولانا مرتضیٰ حسین صاحب فاضل لکھنوی کے مفید مشورے میسر آتے رہے۔ جناب ضمیر اختر نقوی کی تحریک و تشویق مدد و معاون رہی اور ان سے مضامین کی فراہمی میں بھی مدد ملی۔ عبدالرزاق صاحب ایم۔اے۔ بی۔ایڈ ہر مرحلے میں مدیر کا ہاتھ بٹاتے رہے اور خواجہ حبیب علی صاحب (پی۔سی۔ایس) مینجنگ سیکرٹری امامیہ مشن نے "انیس نمبر" کی اشاعت کے لئے تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مدیران سب کا اور خاص طور پر مقالہ نگار حضرات کا شکر گزار ہے۔

تصاویر

اس شمارے میں چند نادر عکس پیش کئے جا رہے ہیں۔

(۱) عکس تحریر میر انیسؔ: یہ ایک قدیم قلمی مرثیے کا ایک صفحہ ہے۔ اصل مرثیہ مولانا مرتضیٰ حسین صاحب کے نفیس کتب خانے کی ملکیت ہے۔

(۲) تصویر میر ضاحک: یہ تصویر کسی خوش قلم مصور نے رنگین بنائی تھی۔ اصل تصویر جناب مسعود حسن صاحب ادیب کی ملکیت ہے۔ وہاں سے متعدد اخبارات و رسائل تک پہنچی۔

(۳) تصویر میر حسن: مثنویات میر حسن (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۵ء) میں بہت خوبصورت و رنگین چھپی تھی۔ اس کے لئے بھی مولانا مرتضیٰ حسین صاحب سے استفادہ کیا گیا۔

(۴) میر انیسؔ کی تصویر اور کئی دیگر تصاویر جناب ضمیر اختر سے حاصل کر کے شائع کی گئیں۔

مکتبہ امامیہ مشن پاکستان ۱۷ نئی انارکلی۔ لاہور

کی

چند نایاب کتابیں

الغفاری

صحابی رسول حضرت ابوذر غفاریؓ کی مفصل سوانح عمری خلفائے بنی امیہ کی سرمایہ پرستی اور اقربا نوازی کے خلاف جس بزرگ نے پرزور احتجاج کیا اور حکومت وقت نے جس کو اس احتجاج کی بنا پر ربذہ کے بے آب و گیاہ صحرا میں شہر بدر کر دیا جہاں پر بڑی بے کسی سے ان کی وفات ہوئی وہی بزرگ جس کے آوازہ حق نے اسلام کے نظام عدل و مساوات کی دبی ہوئی آواز میں حرکت پیدا کی۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ؎

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدر، صدق بوذر، فقر سلمانی

مولانا نجم الحسن صاحب کراروی نے اپنی اس تصنیف میں تحریک اسلامی مساوات کے نظام عدل پر بھی بحث فرمائی ہے۔ ولایتی کپڑے کی سنہری ڈائیدار جلد، سفید کاغذ طباعت و کتابت بہت عمدہ ۴۰۰ صفحات قیمت 6/50

معراج انسانیت

نابغۂ روزگار اسلام کے عظیم مفکر سید العلماء جناب علامہ علی نقی صاحب قبلہ کا تازہ شاہکار جس میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کی سوانح حیات کو اس نقطۂ نگاہ سے واضح کیا ہے جس کے باعث انسان عملی طور پر اشرف المخلوقات سمجھا جاتا ہے یہ مختصر تصنیف عرفان و معرفت کا خزینہ ہے۔

کارڈ بورڈ کی سہ رنگی جلد آفسٹ طباعت، سفید کاغذ ۱۰۰ صفحات، قیمت -/2

حضرت امام حسینؑ شہید

اہل بیت رسول اہل اسلام کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ محمود عباسی کی رسوائے عالم کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کی تردید میں یہ کتاب اہل سنت کے مشہور عالم اہل قلم ابو محمد امام الدین رامنگری (انڈیا) کی تصنیف ہے۔ جس کی ہر حلقہ میں پذیرائی ہو گی ہے اور جس میں عباسی کی پُرفریب مغالطہ آمیز بد دیانتی کی دندان شکن تردید کی گئی ہے۔

مجلد سہ رنگا ڈسٹ کور سفید کاغذ، نظر نواز طباعت و کتابت ۲۷۱ صفحات، قیمت 3/75

خزینۃ المجالس

امام حسینؑ اور کربلا کے ذکر کے عظیم اجتماعات میں ممتاز علماء کرام کی ۲۵ تقریروں کا مجموعہ جس میں مختلف مطالب مضامین کے دریا موجزن ہیں۔

مجلد نیوز پرنٹ، کتابت و طباعت معیاری قیمت ۔/۵

اسوۂ حسینی

امام حسینؑ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور قیامت تک اس شہید کی بے نظیر قربانی پر لکھا جاتا رہے گا۔ جس میں رفتار زمانہ

کے ساتھ نئے نئے پہلو اجاگر ہوں گے۔ جناب سید العلماء مدظلہ العالی نے امام عالی مقام کے جہادِ کربلا کے رموز و اسرار کے ایسے گوشوں کو منور کیا ہے۔ جو حسین شناسی کے بعد انسانی معاشرہ کو ملکوتی اوصاف سے مزین کرنے میں مدد دیں گے۔ اسلام کی تعلیم امن پسندی، سرکارِ رسالت مآب صلعم کی صلح حدیبیہ، جنگ حنین کی صلح، امام حسنؑ کی امن پسندی اور رواداری کے ساتھ حمایتِ حق امام حسینؑ کی صلح پسندی اور جنگ کے حیرت انگیز مظاہر اور حکیمانہ مصلحتوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ سرکار سید العلماء کی ذمہ دارانہ قلم کا جگمگاتا شاہکار ہے۔

مجلد سرورق رنگا ڈسٹ کور سفید کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب

۱۴۴ صفحات قیمت = 2/75

ناموس اسلام

واقعہ ہائلہ کربلا پر ایک مفصل کتاب ہے جس میں جہادِ کربلا پر قرآن و حدیث تاریخ اور مشاہیر عالم کی آراء کی روشنی میں واقعہ کے اسباب، نتائج اور تفصیلات پر صاحبِ فضیلت مآب خلیفہ محمد ہاشم صاحب چٹپالوی نے بڑے دلنواز انداز سے حقائق کو جمع کیا ہے۔

حصہ اول مجلد سرورق رنگا سفید کاغذ، عمدہ کتابت و طباعت، ۳۰۸ صفحات، قیمت = -/6

حصہ دوم مجلد سرورق رنگا سفید کاغذ، عمدہ کتابت و طباعت، ۲۰۴ صفحات، قیمت = -/8

خلافت و امامت

اسلامی ادب میں پیغمبرِ اسلام صلعم کی جانشینی یعنی خلافت کا مسئلہ بڑا معرکۃ الآرا موضوع ہے۔ نیاز فتح پوری کے ایما پر نگار جیسے سنجیدہ مجلہ میں اس اختلافی مسئلہ پر ہندوستان کے چوٹی کے اہلِ قلم نے شیعہ و سنی نقطۂ نگاہ کو علمی استدلال اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ کتاب حرفِ آخر ہے۔ مضبوط جلد مع ڈسٹ کور سفید کاغذ طباعت و کتابت فل سوتی کے [illegible] صفحات قیمت = -/12

مقصد حسین

امام حسینؑ اسیرانِ اہلبیت جناب امام زین العابدین اور مخدراتِ عصمت و طہارت کی تمام وہ تقاریر و خطبات جو سفر مدینہ سے لے کر راہِ کربلا، دشت نینوا، بازار کوفہ و شام اور دربار ابن زیاد اور دربار دمشق میں کی گئیں جن سے عزم اور بے نظیر جہادِ کربلا کے مقصد پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ مولانا سید علی جعفری ایم۔ اے مدظلہ العالی نے مستند کتب سے عربی عبارات کے مقابلہ میں ان کا اردو ترجمہ لکھا ہے حقائق معلوم کرنے کی مستند دستاویز ہے

غیر مجلد کاغذ خوبصورت کتابت و طباعت معیاری ۲۰۸ صفحات قیمت = 2/50

اکابرینِ اسلام کا سائنسی شعور

سائنس اسلام کی مرید ہے۔ مولانا اشتیاق حسین صاحب شاہدی نے تحریر داران علوم اسلامی ائمہ اہلبیت کے وہ اقوال اس کتاب میں جمع کئے ہیں۔ جن کی تصدیق موجودہ سائنسی انکشافات نے کی ہے اور کچھ وہ اقوال ہیں جن کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے ابھی سائنس کو اور ترقی کرنا ہے۔

مجلد رنگین کارڈ بورڈ، سفید کاغذ، طباعت و کتابت عمدہ

صفحات ۸۸، قیمت = -/6

مقامِ انیس

محشر زیدی

جو اہلِ دل ہیں سمجھتے ہیں وہ مقامِ انیس
یہ فنِ مرثیہ گوئی میں اہتمامِ انیس
حسینیت کی جو خدمت انیس نے کی ہے
رہے گا تا بہ قیامت بلند نامِ انیس

اعجاز رحمانی

وہ جس کے نام پہ اقلیم شاعری ہے نثار

میر انیس

ضیائے بزمِ ادب شمع ذی وقار انیسؔ — سخن ہے جس کا ہر اک کان میں گہر کی طرح
برائے شعر و سخن وجہِ افتخار انیسؔ — وہ جس کی فکر میں وسعت ہے بحر و بر کی طرح
جہانِ فکر میں یکتائے روزگار انیسؔ — غریقِ موجِ سخن تھا کہ سر اٹھا کے چلا
انیسؔ کون وہی مرثیہ نگار انیسؔ — بہارِ باغِ سخن وہ ہمیں دکھا کے چلا

وہ جس کی فکر پہ احساس برتری ہے نثار — تمام عمر جو مداح اہل بیت رہا
وہ جس کے نام پہ اقلیم شاعری ہے نثار — قصیدہ غیر کا جس نے کبھی کہا نہ پڑھا

وہی انیسؔ کہ معیار ہے قلم جس کا — کبھی نہ کھوئی سلیمان بن کے اپنی ہوا
وہی انیسؔ کہ معمار ہے قلم جس کا — دل و نظر میں رہے واقعاتِ کرب و بلا

وہی انیسؔ کہ گلزار ہے قلم جس کا — ہر اصول جو کانٹوں میں پھول بن کے رہا
وہی انیسؔ کہ تلوار ہے قلم جس کا — وہ عندلیبِ ریاضِ رسولؐ بن کے رہا

خطوط وہ دمِ تحریر کھینچ دیتا ہے — ذرا جو دامنِ افکار کو نچوڑ دیا
کہ رزم و بزم کی تصویر کھینچ دیتا ہے — دل و نگاہ کے احساس کو جھنجھوڑ دیا
وہ جس کا رنگ کبھی فق نہیں سحر کی طرح — ہر ایک لفظ کو آپس میں ایسے جوڑ دیا
نہیں وہ حسن جو ڈھل جائے دوپہر کی طرح — کہے وہ شعر کہ جیسے قلم کو توڑ دیا

کوئی جواب فصاحت میں ہو نہیں سکتا
کلام اُس کی بلاغت میں ہو نہیں سکتا

تھے کل بھی اور ہزاروں ہیں آج بھی فنکار
سخن شناس سخن فہم صاحبِ اشعار
بہت ہے لیلیٔ فن پر ہیں جان و دل سے نثار
ہے اب بھی باغِ سخن میں طرح طرح کی بہار
بدلتے جائیں گے عنوان ہر فسانے میں
کوئی انیس نہ ہوگا مگر زمانے میں

انیس مرثیہ گویوں میں بے مثال ہے تو
کمال جس پہ فدا ہے وہ باکمال ہے تو
برائے علم و ادب مہرِ لازوال ہے تو
سخنوروں کیلئے آج بھی سوال ہے تو
ترے خیال کا جادہ بدل نہیں سکتا
تری روش پہ کوئی اب بھی چل نہیں سکتا

عزت لکھنوی

انیسِ نکتہ سنج

مرثیے کا دُرِ شہوارِ مجلّٰی ہیں انیس
موجۂ فکر ہیں مضمون کے دریا ہیں انیس
ذوقِ شعری ہے زمیں عرشِ معلّٰی ہیں انیس
مدحتِ شاہ کا دعویٰ ہے کہ یکتا ہیں انیس
برتر از دعبل و فردوسی و مقبل ہیں انیس
نظمِ شیرازی و حسان کا حاصل ہیں انیس
ایسا بے مثل سخنور کہیں دیکھا نہ سنا
شوکتِ شعر کا مظہر کہیں دیکھا نہ سنا
مدحتِ آل کا محور کہیں دیکھا نہ سنا
لفظ و معنی کا سمندر کہیں دیکھا نہ سنا

گفتگو ایسی کہ ہر بات سے موتی برسیں
شعر سن لیں تو چہکنے کو عنادل ترسیں

فن کا وہ اوج کہ حیرت سے نظیری دیکھے
گیسوئے نظم میں لفظوں کی اسیری دیکھے
عرفی اقلیمِ تخیل کی امیری دیکھے
اس گدائے درِ حیدرؑ کی فقیری دیکھے
قوتِ طبعِ ظہوری کو حیا آتی ہے
عظمتِ لوح و قلم اسکی قسم کھاتی ہے

ذرۂ خاک کو گوہر کی جلا دی اس نے
طبعِ خاموش میں ہل چل سی مچا دی اس نے
جب بھی فطرت کے مظاہر کو صدا دی اس نے
شعر میں نطق کی تصویر دکھا دی اس نے
بزم کا رنگ جمایا تو عجب کام کیا
کھینچکر رزم میں تلوار بڑا نام کیا

ذکرِ گل ہو تو فضا رنگِ جوانی مانگے
سبزہ لہرائے تو دریا کی روانی مانگے
ضربِ شمشیر اگر کوئی نشانی مانگے
مرحبِ قوتِ کفار نہ پانی مانگے
چہرۂ مہر کو شعروں میں چمکتے دیکھو
تودۂ برف سے شعلوں کو لپکتے دیکھو

یہ سلاست یہ فصاحت یہ خطابت یہ بیاں
حسن کا شوکتِ الفاظ میں دریا سا رواں
دسترس ایک سی دونوں پہ یقیں ہو کہ گماں
سادگی ایسی کہ منہ چوم لیں خاصانِ زباں
برشِ تیغِ تخیل سے ہمیں دنگ کیا
نظم یک رنگئ افکار کو چو رنگ کیا

حسین اعظمی

انیس

○

یہ امر واقعی ہے مرا ادّعا نہیں — شاعر انیس کا سا کوئی دوسرا نہیں
اُس کا کلام گوکہ کلامِ خدا نہیں — پھر بھی جواب اس کا کوئی لا سکا نہیں
اشعار آبدار میں موتی پروئے ہیں
کوزوں میں علم و فکر کے قلزم سموئے ہیں

○

انسانی نفسیات کا وہ تھا مزاج داں — فطرت کا ترجمان، حقیقت کا ہم زباں
جو بات اُس نے نظم کی ہوتا ہے یہ گماں — موجود خود تھا جیسے کہ وہ خوش بیاں وہاں
لفظوں کے قالبوں میں بشر ڈھالتا تھا وہ
عیسیٰ نفس تھا مُردوں میں جاں ڈالتا تھا وہ

○

مشاطۂ عروس جمالِ سخن تھا وہ — پارکھ تھا نقدِ شعر کا، میزانِ فن تھا وہ
بانی تھا طرزِ نو کا، روایت شکن تھا وہ — خود بوستانِ نظم تھا، اک انجمن تھا وہ
تحریر اُس کی سحر کا نعم البدل بنی
جو بات اُس نے کہہ دی وہ ضرب المثل بنی

○

اُس کا قلم تھا حق و صداقت کا آئینہ
انسان دوستی کا شرافت کا آئینہ
کردار ساز علم و ہدایت کا آئینہ
تبلیغِ دین کا جوش شہادت کا آئینہ
وہ ترجمانِ مقصدِ ذبحِ عظیم تھا
وہ طورِ دشتِ کرب و بلا کا کلیم تھا

○

حق کوش و حق فروغ و حقیقت نگار تھا
دینی صداقتوں کا وہ آئینہ دار تھا
مظلوم کا رفیق تھا ظالم شکار تھا
اُس کا قلم بھی ہم روشِ ذوالفقار تھا
باطل شکن تھا ضربِ یداللہ کی قسم
مرحب فگن تھا حربِ یداللہ کی قسم

○

کبیر انور جعفری

یادِ انیس

اعلی اللہ مقامہ

کتنے پیارے شعر ہیں مہکی سی گفتاروں کے بیچ
پھول بھی بکھرے ہوئے ہیں تیری رفتاروں کے بیچ
تیرے فنِ شاعری کی پیروی کرتے ہوئے
مرثیہ خواں سب نظر آتے ہیں درباروں کے بیچ
تو نظر آتا نہیں آنکھوں سے اوجھل ہے مگر
ہو رہی ہیں محفلیں تیرے پرستاروں کے بیچ
رنگ لایا تھا مگر تیرے قلم کا معجزہ
مرثیے لکھے گئے کوفے کی دیواروں کے بیچ
مجلسِ شاہِ شہیداں پر نہیں موقوف کچھ
ذکر ہوتا ہے ترا دنیا کے بازاروں کے بیچ
رہتی دنیا تک یہی ہوتا رہے گا روز و شب
نام ہے زندہ ترا تا حشر اخباروں کے بیچ
ہے کبیرؔ انور انیسِ نکتہ پرور کا غلام
نام کیوں چمکے نہ اس کا آج فنکاروں کے بیچ

رفیق رضوی (کراچی)

میر انیس

وشت و دریا، درو دیوار کی آواز انیس گو ہر وخشت، گل وخار کی آواز انیس
ہمت و جرأت و افکار کی آواز انیس یعنی ہر قوتِ اظہار کی آواز انیس

فکر فانی ہے نہ افکار ہیں فانی اس کے
ہمنوا ہیں لغت ولفظ و معانی اس کے

اس کی آواز ہے ہر غنچہ دہن کی آواز اس کی آواز ہے ہر صنفِ سخن کی آواز
اس کی آواز ہے ہر سرو سمن کی آواز اس کی آواز ہے یارانِ چمن کی آواز

مثنوی شوکتِ الفاظ و معانی مانگے
مرثیہ اس کے تکلم سے جوانی مانگے

اس کی آواز ہے گلزار و صبا کی آواز اس کی آواز ہے طوفان و ہوا کی آواز
اس کی آواز ہے انعام و وفا کی آواز اس کی آواز ہے مردانِ خدا کی آواز

نیزہ و دمدمہ و تیغ و تبر کی آواز
اس کی آواز ہے جبریل کے پر کی آواز

دہر سے جہل کے اثرات کو کم اس نے کیا ایک ہی بات کو سو طرح رقم اس نے کیا
وادی و دشت کو فردوس وارم اس نے کیا حد تو یہ نوکِ قلم کو بھی قلم اس نے کیا

نازکی ہے نہ مضامین میں باریکی ہے
جس جگہ اس کی تاسی نہیں تاریکی ہے

لفظ کے کاکل و گیسو کو سنوارا اس نے — حرف کے نقطہ و پہلو کو سنوارا اس نے
غازۂ فکر سے گلِ رو کو سنوارا اس نے — نظم کے چہرہ و ابرو کو سنوارا اس نے

نونہالانِ زباں اس کے سبب شیر ہوئے
مستند اس کے سخن سے زبر و زیر ہوئے

حلم، اوصاف، کرم، فہم، متانت، اطوار — علم، ادراک، عمل، ذہن، تجسس، کردار
بین، آداب، فنِ حرب، خموشی، گفتار — نیمچہ، تیغ، تبر، گرز، کٹاری، تلوار

اس کی محفل نہ کسی چیز سے خالی پائی
اس کی اقلیم سخن سب سے نرالی پائی

مصحفِ رخ کی اسے قوت تفسیر ملی — نور سے پنجتنِ پاک کے تنویر ملی
اس کو دربارِ محمدؐ سے یہ توقیر ملی — دہر میں نام ملا، خلد میں جاگیر ملی

"دردِ سر ہوتا ہے بے طور نہ فریاد کریں"
"بلبلیں اس سے گلستاں کا سبق یاد کریں"

اس کا بے مثل ہے اندازِ بیاں اے رضوی — ڈال دی اس نے تنِ بیت میں جاں اے رضوی
اس نے ذروں کو کیا کاہکشاں اے رضوی — مستند دہر میں ہے اس کی زباں اے رضوی

حرف و الفاظ کے لشکر کا علمدار ہوا
فوج ایسی نہ ہوئی، ایسا نہ سردار ہوا

سید امجد علی اشہری

میر انیس ـــــ اور ـــ اُن کی مجالس مرثیہ خوانی

میر مستحسن خلیق کو خدا نے ایک بیٹا عنایت کیا جو ابھی ایک ستارہ ہے۔ لیکن آگے چل کر شاعری کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا اور امام علیہ السلام کی خدمات سے اپنے فرجد امامی ہبرو مین کا نام کرنے والا ہوگا۔

اس وقت میر خلیق کی حالت معمولی طور کی تھی فیض آباد میں تھے اور کبھی کبھی لکھنؤ تشریف لایا کرتے تھے۔ صاحبزادہ کے پیدا ہوتے ہی کاشانۂ سیادت روشن ہوگیا اور گھر میں ایک نئی دولت کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ضروریات خانگی میں بھی غیر متوقع سہولتیں پیدا ہوئیں، اور ایک باطنی روح مشکلکشائی کو آمادہ پائی جانے لگی۔ صورت کا رعب داب دیکھ کر "ببر علی" نام رکھا گیا۔

میر خلیق نے صاحبزادہ گرامی کی تعلیم و تربیت کا وہیں فیض آباد میں بندوبست کیا اور خود ان کے خاندان کی تعلیم و تربیت پر پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا شفیق اور لائق باپ نے انیس تخلص تجویز کیا۔ پھر صاحبزادہ کو عنفوان شباب میں لے کر لکھنؤ تشریف لائے۔ میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اور ۱۲۹۱ھ میں رحلت فرمائی۔ اس حساب سے ۱۲۲۰ ہجری یا اس کے قریب قریب زمانۂ پیدائش معلوم ہوتا ہے جو قمری حساب سے سمجھنا چاہیئے اور شمسی حساب سے ڈھائی برس کم ہو جائیں گے۔ ۵۶، ۵۷ برس مشق سخن میں گزرے۔

میر انیس کی تعلیم

میر انیس کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھنؤ تشریف لائے یہاں اپنی پرائیویٹ تعلیم کو جاری رکھا اور چالیس برس کی عمر تک مطالعۂ کتب سے بے نیاز ہوگئے۔ لکھنؤ میں میر انیس کو عالمانہ درجہ میں تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن ان کی معلومات علمیہ کا سب کو اقرار ہے۔ علی محمد خان صاحب شاد رئیس عظیم آباد اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میر صاحب کا علمی مذاق اس درجہ کو پہنچا ہوا تھا جو شاعری کی تمام ضرورتیں پوری کرسکتا ہو۔ جو ایسے مستند استاد کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ چنانچہ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب صدرہ کی ایک عبارت پر بحث کر رہے تھے اور میر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہ آواز میر صاحب کے کان میں پڑ گئی میر صاحب نے فرمایا۔

کیا بحث ہے ؟

انہوں نے ادب سے سامنے آکر وہ مقام پیش کیا میر صاحب نے دیکھا بھی نہیں اور زبانی وہ عبارت پڑھ کر اس مسئلہ کو اپنے لاثانی حسن بیان سے اس خوبی کے ساتھ حل کیا کہ ہم سب سن کر دنگ رہ گئے۔

میر صاحب کو بہ نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی اور اکثر میر صاحب کے زیر مطالعہ وہی کتابیں رہتی تھیں

جو اپنا مثل نہیں رکھتیں اور عام دلچسپی کی مستحق ہیں۔

میر صاحب کی مختصر لائبریری میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں جمع تھیں جو سب کی سب ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔

میر صاحب کے پاس اکثر اعلیٰ درجہ کے علماء ادبا اور مستند باکمال تشریف لاتے تھے اور میر صاحب ہر ایک سے ان کے درجہ و مقام کے موافق گفتگو فرماتے تھے۔

میر انیس کا خاندان

میر انیس کے گھر اور خاندان میں ہندوستان کی شاہی خیل کے طرز و انداز اور طرز معاشرت اور شریفانہ اخلاق کے مکمل نمونے جمع ہو گئے تھے جو بوڑھوں سے جوانوں اور جوانوں سے بچوں کو مسلسل طور سے پہنچے تھے اور ساں کی آنکھوں نے دلّی، لکھنؤ، فیض آباد میں ہر طرح کی حسن معاشرت اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے اخلاق و ادب کو دیکھ کر خود کو اعلیٰ تہذیب کا بہترین نمونہ بنا رکھا تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اخلاق شرافت اور ادب و ثقافت سے واقف اور اسکی پابند تھیں۔ چنانچہ میر محمد رضا رضی تاریخ "تاج الخواتین" میں لکھتے ہیں کہ

"میر خلیق کی پاک دامن بی بی (یعنی میر انیس کی والدہ ماجدہ) مسائلِ مذہب اثنا عشری سے واقف تھیں اور فارسی اتنی جانتی تھیں جو جامع عباسی کو پڑھ لیتیں اور پڑھا دیتی تھیں۔ وہ نماز روزہ کی پابند اور انتہا سے زیادہ پرہیزگار تھیں۔ وہ ہر بات کو مذہب امامیہ اثنا عشریہ کے موافق کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی وضع، ان کا لباس، ان کی رفتار و گفتار دوسری بیبیوں کے لئے شریفانہ وضع کا مستند نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ بڑی بڑی امراء زادیاں اور بیگمات ان سے ملنے کی خواہش مند رہتی تھیں۔ لیکن دخل کیا جو وہ بغیر کسی تقریب و طلب کے گھر سے باہر جائیں۔ وہ خود کو ہر باب میں پابند ادب رکھنا پسند کرتی تھیں اور ان کو اخلاق رزیلہ اور سوء ادبی سے سخت نفرت تھی۔"

پس میں کہتا ہوں کہ میر انیس کو اعلیٰ تربیت کا ابتدائی علمی حصہ جو اپنی مادرِ محترم کی تربیت و تادیب سے حاصل ہوا وہ خاص قسم کا ہے جو بڑے سے بڑے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

دلّی میں میر کاظم علی سفید پوش، پٹہ، بانک، بنوٹ کے استاد تھے مگر جب دلّی کے اہل کمال باہر جانے پر مجبور ہوئے تو میر کاظم علی لکھنؤ میں تشریف لائے اور میر خلیق کے مکان کے پاس مکان لیا۔ اس سے پہلے دونوں خاندان دلّی میں بھی ایک دوسرے سے تعارف رکھتے تھے اور میر انیس نے امراء زادگان فیض آباد کے ساتھ اور اپنے ذاتی شوق سے ایک حد تک شہسواری اور سیف زنی کی مشق کی تھی اور طبیعت میں اس کا شوق باقی تھا اس لئے میر خلیق نے میر کاظم علی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ میرے لڑکے کو کچھ بتا دیا کریں۔ میر کاظم نے بہت خوشی سے اس کو منظور کیا لیکن وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے بیٹے میر امیر علی کو اس کام پر مامور کر دیا۔ میر انیس نے "علی مدد" کڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی کچھ گھاتیاں ان سے سیکھیں، یہاں تک کہ وہ اس باب میں بہت جلدی صفائی اور چابکدستی ظاہر کرنے لگے۔ بلکہ کسی کسی کام میں میر امیر علی پر چوٹ کر جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بھاگڑ میں میر امیر علی بی بی بچوں کو لے کر بنارس چلے گئے۔ وہاں سے حیدر آباد جانے کا قصد کیا۔ درمیان میں نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ ریاست

ریاست بھوپال کے حضور میں رسائی ہوئی، مردم شناس رئیسہ نے میر امیر علی کی شریفانہ وضع اور قابل دیدار صورت دیکھ کر ان کو روک لیا۔ اور بعد چند سال جب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ نو دس برس کی ہوئیں تو ان کو سکھانے پر مامور کر دیا۔ بھوپال میں میر امیر علی کئی برس تک میرے ہم محلہ رہے ہیں وہ اکثر میر انیس کے حالات بیان کرتے رہتے تھے۔

ان کا رکھ رکھاؤ

میر امیر علی کہتے تھے کہ میر انیس کو اس عمر اور اس حالت میں بھی اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی خودداری کا اتنا خیال رہتا تھا کہ میں نے کبھی میر انیس کو ننگا نہیں دیکھا اور نہ وہ ننگے بدن مشق فن کرتے تھے بلکہ اس کے مناسب کپڑے بنائے تھے اور بالاخانہ کی چھت پر مشق کرتے تھے جہاں میرے اور ان کے سوائے دوسرا نہ ہوتا تھا۔ ان کا قول تھا کہ اگر میر انیس کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں مدو ساہی یا بھوپال کے چار پیسے والا پیسہ بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے اور ان کی چوٹ کو خوب جاننے والے کے سوائے کوئی روک نہ سکتا تھا۔

میر انیس کے خاندان میں عام طور سے ورزش کا چرچا تھا اور میر انیس نے تو تمام عمر اس کی پابندی کی۔ میر صاحب ایک علیحدہ کمرے میں ورزش کرتے تھے۔ جہاں دوسرا کوئی نہ جا سکتا تھا۔ میر صاحب کی ورزش معتدل ہوا کرتی تھی جو حفظ صحت اور تنومندی کے لئے ہر وقت کے مناسب حال تھی۔ نہ اتنی کم جس کا اثر محسوس نہ ہو، نہ اتنی زیادہ جو پہلوانوں کی طرح پسینے پسینے کر ڈالے۔ ڈنٹر فرش پر کرتے تھے جو عموماً پچاس ساٹھ کی تعداد میں ہوتے اور سو دو سو ہاتھ مگدر کے ہلاتے اور جسمانی بناؤ سدھار کا خاص خیال رکھتے۔ آخر عمر میں ورزش گھٹ گئی تھی اس پر بھی کہتے ہیں کہ چند ڈنٹر کرنا اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر کے ہلانا موقوف نہیں ہوا۔

انیس کی خودداری

میر انیس کو اپنی خودداری کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس لئے مخصوص اوقات میں وہ اپنے خلوت خانے میں تشریف لے جاتے اور اندر سے دروازے کی زنجیر بند کر لیتے تاکہ کوئی ایک لڑکا تک اندر نہ آئے یہاں بے تکلف ہو کر بیٹھتے، کبھی ٹہلنے لگتے، کبھی دوسرے شغل سے جی بہلاتے۔ اس مکان میں ایک حوض بھی ہے۔ اکثر موسم گرما میں اس میں غوطے لگاتے۔ اکثر اسی حالت خلوت میں دس دس بیس بیس پچاس پچاس بند کہہ ڈالتے جو ان کے لوح حافظہ پر لکھ جاتے، اور جب باہر تشریف لاتے تو میر مونس یا میر نفیس یا اور کسی عزیز شاگرد سے جو حاضر ہوتا لکھنے کا ارشاد کرتے اور مسلسل لکھوا دیتے۔

ہر چند طبقہ شعراء میں شہزادہ علی حزین اور میر تقی میر اور شیخ امام بخش ناسخ وغیرہ کی نازک دماغیاں مشہور ہیں لیکن میر انیس اعلی اللہ مقامہ کی تمکین و خودداری نے ان کے رکھ رکھاؤ میں ایک شاہانہ حالت پیدا کر دی تھی جو ایک ایسے عالی دماغ اور بادشاہ اقلیم سخن کے لئے زیبا ہو سکتی ہے۔ ان کی ہر بات ایک قاعدے کی پابند تھی۔ ان کے اخلاق و آداب اور معاشرت کا دستور العمل جیسے ان کی اپنی ذات سے ہر فعل کی پابندی کراتا تھا ویسی ہی دوسرے کو حد ادب سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ میں نے جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا اور نواب بدھن جیسے اکابر لکھنؤ سے سنا ہے کہ میر صاحب تک پہنچنے، اور ان سے ہم کلام ہونے کے لئے دربار کی قسم کے چند قاعدوں کی پابندی لازم تھی۔ کوئی یوں بے تکلف سامنے نہ جا سکتا تھا۔ جب تک میر صاحب اس کے آنے کی اجازت نہ دے دیں یا ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے۔ روزمرہ کے آنے جانے والے بھی اطلاع کے بعد باریاب ہوتے تھے اور جب

میر صاحب باہر تشریف رکھتے تھے تو اپنی وضع کے پورے لباس میں زیب افزائے صدر نظر آتے تھے۔ ان کی معمولی باتوں میں بھی اوائے کلام سے اعجاز فصاحت کا اثر ظاہر ہوتا تھا اور وہ معجز بیانی ان کا حصہ تھی جو دوسری جگہ نہ مل سکتی تھی اور ان پر ختم ہو گئی جس کو ان کے دیکھنے والے آج تک یاد کرتے اور نہ دیکھنے والوں کو محو حیرت بناتے ہیں اور میر انیس جس دن لکھنؤ تشریف لائے بغیر فینس کے کہیں باہر نہیں نکلے جو پچھلے زمانے میں امیرانہ سواری تھی اور اکثر ثقات شہر اسی پر سوار ہوتے تھے۔

میر انیس کی طبیعت حسن پرست واقع ہوئی تھی جو ایک ایسے شاعر کے لئے ضروری اور لازمی ہے اگر وہ صفت نہ ہو تو ایسا شاعر بن ہی نہیں سکتا۔ میر صاحب کو ایک اچھے پھول کا دیکھ لینا ان کے وجدان کی تحریک کا ذریعہ ہو جاتا تھا۔ میر صاحب جمادات، نباتات، حیوانات میں محاسن قدرت کا نظارہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے۔ یہی وجدان ہے جو جا بجا ان کی تصنیف سے رنگ گل بن کر ٹپکتا ہے۔ اسی وجدان نے ان کو مناظر قدرت کی پر بہار وادی میں ہر برگ و گل کو دیکھ کر لفظوں میں اس کی تصویر اتارنے سے بہزاد و مانی پر فائق کر دیا ہے۔

انیس کی شکل و صورت

(۱) میر انیس کا قد لانبا۔ چھریرا۔ متناسب الاعضا تھا۔ (۲) سر کے بال باریک اور ملائم (۳) چہرہ خوبصورت و کتابی (۴) رنگ کھلا ہوا گندمی (۵) آنکھیں بڑی بڑی خوبصورت جن کی خوش آب سفیدی نرگس کا لطف دیتی ہے۔ آنکھوں کے تیور سے غیورانہ حالت ظاہر ہوتی تھی۔ پتلی کی روشنی بہت تیز تھی۔ (۶) مونچھیں بڑی بڑی ڈاڑھی صاف (۷) گردن صراحی دار۔ گردن فرازی کے معنی ظاہر کرنے والی (۸) سینہ کشادہ اور عریض مگر زیادہ ابھرا ہوا نہیں (۹) چال نہایت نستعلیق۔ دخل کیا جو نپے تلے قدم سے آگے بڑھ جائے۔

لباس اور وضع قطع

میر انیس لکھنؤ میں اس وقت تشریف لائے جب کہ درباری لباس ایک خاص تہذیب کا پابند تھا۔ اور ثقات شہر نے اپنے لئے ایک خاص وضع اختیار کر رکھی تھی جو دلی کے بعد لکھنؤ کے لئے خاص بھی جاتی تھی اور اس کو دیکھ کر لکھنؤ کی بود و باش کا امتیاز ہوتا اور وہ بالکل مشرقی لباس سے مرکب تھی۔ اس وقت میر صاحب نے اپنے لئے وہ لباس اختیار کیا جو آخر وقت تک ان کے جسم پر موزوں رہا اور اس درمیان لکھنؤ کی وضع میں کئی تغیرات ہوئے اور زبان نے بھی کئی رنگ بدلے لیکن میر انیس کی وضع ان کی زبان کی طرح وہی رہی جو پہلے تھی۔

میر انیس اپنے سر پر لکھنؤ کی پیچ گوشہ ٹوپی لگاتے تھے اور ٹوپی کی درستی اور خوبصورتی سے لگانے میں ان کو بڑی دلچسپی رہتی تھی جب وہ کہیں تشریف لے جاتے تو گروں پر چڑھی ہوئی آٹھ دس ٹوپیاں حاضر کی جاتیں۔ وہ جس کو پسند فرماتے اس کو سر پر رکھتے اور آئینہ سامنے رکھ کر اس کو بار بار درست کرتے۔ جب تک وہ صحیح موزونیت حاصل نہ کرتی وہ اس شغل سے باز نہ آتے۔ بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ ٹوپیوں کے تبدیل و بدل اور اس شغل میں صرف ہو جاتا۔ آخر میں جب کوئی ٹوپی صحیح مقام حاصل کر لیتی تو پھر اسی مقام پر اسی شان سے قائم رہتی۔ جسم میں ایک خاص وضع کا گھیر دار کرتہ پہنتے تھے اور صرف یہی کرتہ ان کی وضعداری کو خاص امتیاز سے ظاہر کرتا تھا۔ کبھی گول پر صے کا انگرکھا زیب جسم فرماتے تھے اور لکھنؤ کے عام رواج کے موافق عرض کے ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے۔ پاؤں میں لکھنؤ کی لدہ

مخمل جوتی شرفِ پابوس حاصل کرتی تھی۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال رہتا تھا۔

میر انیس کی پہلی مجلس

جن دنوں میر انیس لکھنؤ تشریف لے گئے۔ لکھنؤ اپنے شباب کے مزے لے رہا تھا۔ ایک طرف شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے مشاعروں سے شاعری کی دنیا گونج رہی تھی۔ دوسری جانب میر ضمیر اور میر خلیق کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی تمام شہر میں دھوم تھی اور بچے بچے کو مرثیے سننے کا شوق تھا۔ اس موقع پر میر خلیق چپکے چپکے اپنے صاحبزادے میر انیس کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا مکمل نمونہ بنانے پر متوجہ تھے اور خود میر انیس کا صحیح وجدان اس باغ میں ایک نئی بہار پیدا کرنے کے لئے آمادہ تھا۔

اس حالت میں میر انیس نے اکثر رباعیاں، متعدد سلام اور مرثیے تصنیف کر کے اپنے شفیق اور استاد باپ کو دکھائے اور تحت اللفظ پڑھنے میں بھی مکان کے اندر بیٹھ کر بہت کچھ مشقِ فن کر لی۔

میر خلیق خاص خاص مجلسوں میں میر انیس کو بھی ساتھ لے جاتے۔ یہ قریب منبر کے بڑی تمکین و متانت سے بیٹھتے اور ختم مجلس تک اسی شان سے بیٹھے رہتے۔ زانو بدلنا کیسا کوئی عضو بھی بے قاعدہ حرکت نہ کرتا۔

میر انیس کی اس متانت سے ارباب مجلس کے دلوں میں ایک خاص گنجائش پیدا ہونا شروع ہوئی اور بعض نے میر خلیق سے صاحبزادہ کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے حالات دریافت کر کے ان کی تصنیف ان کی زبان سے سننے کی خواہش ظاہر کی۔ آخر کار ایک بہت بڑی مجلس میں میر خلیق نے مرثیہ پڑھا اور حسب معمول بے انتہا تعریف ہوئی اور مالِ مجلس بھی حاصل ہوا۔ لیکن آواز کے ضعف نے ارباب مجلس کے دلوں پر ولولہ انگیز اثر نہ ڈالا جو ممکن ہے کہ شفیق باپ نے خود اپنے بیٹے کے دل بڑھانے اور مجلس پر ہونہار فرزند کے جدید اثر کو نمایاں کرنے کی غرض سے اپنی آواز میں ضعف کے آثار پیدا کر لئے ہوں۔ یا فی الحقیقت ویسا ہی ہوا ہو۔ بہر حال مرثیہ ختم کرنے کے بعد میر خلیق نے ارباب مجلس کو متوجہ کر کے کہا۔

آپ صاحبوں نے اکثر میرے لڑکے کے سننے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے آج سن لیں۔

یہ کہہ کر میر انیس کو اشارہ کیا۔ وہ نہایت وقار و ادب سے اُٹھے اور میر خلیق منبر کے دوسرے زینے پر بیٹھے تھے۔ یہ اس سے ایک درجہ بلند تیسرے زینے پر بیٹھ گئے اور اس وقار اور خوبصورتی سے بیٹھے کہ تمام ارباب مجلس کی نگاہوں میں وہ خوبصورت ٹھاٹھ جم گیا اور میر انیس کا خوبصورت چہرہ اور ورزشی بدن اور عنفوانِ شباب کی جوشیلی امنگ مل جل کر ایک غیر معمولی اثر ظاہر کرنے لگی۔ پہلے میر صاحب منبر پر نقشِ تصویر ہو کر چند منٹ چپ بیٹھے رہے۔ پھر ایک رباعی پڑھی۔ پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے ایک غیر معمولی لطف پیدا کیا اور چاروں طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر میر انیس نے ایک سلام پڑھ کر ساری مجلس کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس کے بعد مرثیہ شروع کیا تو رزم و بزم کی تصویر اس خوبی اور خوبصورتی سے دکھائی کہ اسی وقت سے دل پر میر صاحب کی فصاحت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اعجازِ کلام اور اندازِ بیان سے کئی مرتبہ ارباب مجلس بے تاب ہوئے اور کئی مرتبہ جوشِ شجاعت اور اندازِ فصاحت کے بندش کر جھومنے لگے۔ قصہ مختصر میر انیس نے پرجوش تعریفوں کی گونجتی ہوئی آوازوں میں مرثیہ ختم کیا۔ سیکڑوں قدر شناس اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر

میر انیس سے مصافحہ کرنے اور ہاتھ چومنے کو سامنے آئے اور تعریف کا سلسلہ دیر تک قائم رہا۔ پھر تو میر صاحب کی شہرت روز بروز بڑھنے لگی اور بڑے بڑے نواب و امیر، وزیر میر انیس کے زیبِ مجلس ہونے پر فخر کرنے لگے اور بہت جلد تمام شہر میں میر انیس کی دھوم مچ گئی اور بتدریج تمام ہندوستان میں ان کا ڈنکا بجنے لگا اور میر انیس کے ساتھ میرزا دبیر کی سخن آرائیاں بھی شہرت پذیر عام ہوئیں۔ اور شہر کے خوش مذاق لوگوں نے دونوں کو حریفِ مقابل قرار دے لیا۔ جیسے میدانِ تغزل میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش ایک دوسرے کے حریفِ مقابل تھے۔

شاہی مجلس میں

تمام شہر لکھنؤ میں میر انیس اور میرزا دبیر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نقادانِ سخن کے جتھے دونوں کی طرفداری میں علیحدہ علیحدہ بٹے ہوئے تھے۔ ہر گروہ اپنے مقتدیٰ کی طرفداری پر زور دیتا تھا کسی ایک مجلس میں دونوں صاحبوں کا جمع ہونا اتنا مشکل تھا جو بغیر خاص تدبیر اور اثر کے ناممکن تھا۔ لیکن لکھنؤ کے حضرات دونوں کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے۔ چنانچہ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جانِ عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کر کے ایسی تقریر کی جس سے بادشاہ دونوں کو ایک مجلس میں پڑھنے کا ارشاد فرمائیں اور بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ اس پر مفتاح الدولہ خود دونوں صاحبوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی پیغام پہنچایا۔ دونوں صاحبوں نے قبول کر لیا۔ روز و وقتِ معینہ پر میرزا دبیر پہنچے اور باریابِ حضوری ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر انیس نے ہر بات کی خبر پہنچنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب یہ حال معلوم ہوا کہ میرزا دبیر پہنچ گئے تو اپنے جانے میں دیر لگانا شروع کی۔ یہاں تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقتِ معینہ سے کچھ وقت زیادہ ہو گیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے، صرف آپ کا انتظار ہے۔ میر صاحب تیار تو تھے ہی اور فینس سامنے حاضر تھی اس پر بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام اربابِ مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب نہایت تمکنت اور وقار سے سیدھے منبر کی طرف گئے۔ اور اپنے قاعدہ مقررہ کے موافق منبر کے پاس بیٹھ گئے۔ نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو ان سے کہا کہ

"آپ حضرت جانِ عالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے۔"

مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی۔ بادشاہ نے اپنی خوشنودیٔ مزاج کا اظہار کیا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر انیس نے اس موقع پر بھی اپنی خودداری کا کیسا خیال رکھا ہے۔ آخرکار مجلس شروع ہوئی پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے پڑھا بادشاہ کی تعریف میں بھی ایک رباعی پڑھی۔ سامعین نے بڑی دلچسپی سے سنا۔ اور واہ واہ سبحان اللہ کی آوازوں سے عالی شان کمرہ گونجنے لگا۔ کمالِ مجلس بھی حاصل ہوا۔ ان کے بعد میر انیس کو پڑھنے کا ارشاد ہوا۔ میر صاحب کچھ سوچ کر رہ گئے تھے میر مونس سے پوچھا۔

"کچھ لائے ہو؟"

انہوں نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا۔ اس کو دیکھا اور فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کیا اور منبر پر تشریف لے گئے۔ میر مونس کا سلام اس وقت کے شاعروں کی طرح پر تھا۔ جس کا ردیف و قافیہ یہ ہے۔

گلستاں ہو کر، بیاباں ہو کر۔

منبر پر جاکر اپنی عادت کے موافق تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے۔ جب تمام مجلس ان کی طرف متوجہ ہوئی تو جناب امیر کی مدح میں ایک رباعی پڑھی۔ چاروں طرف سے آفریں و مرحبا کا شور بلند ہوا۔ اس کے بعد سلام شروع کیا جس کا وہ فی البدیہہ مطلع یہ ہے ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتیں ادائے کلام کے مزے لینے لگیں اور میر انیس کے انداز بیان نے تمام درباری لوگوں کو سمجھا دیا کہ ہم اس موقع پر بھی اپنے درجۂ کمال سے نیچے اترنے والے نہیں۔ سلام ختم کرکے میر صاحب نے مرثیہ کے چند بند پڑھے۔ جس سے اہل مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور رزم و بزم دونوں کا حق ادا کرکے منبر سے اترے۔ میر صاحب کے اشارات کو بادشاہ بھی سمجھ گئے جو منبر کے عقب میں شہ نشین پر تشریف رکھتے تھے اور نواب مفتاح الدولہ اور حاضرین سے میر انیس کے سلام کے متعلق کہا کہ

اس زمین میں ہم نے بھی سلام لکھا ہے۔ دونوں کا انداز بیان یکساں معلوم ہوتا ہے۔

حاضرین نے کہا۔

جی پیر و مرشد کیوں نہیں۔

پھر میر انیس کو سامنے یاد فرما کر تعریف کی۔ میر صاحب آداب بجالا کر رخصت ہوئے۔ تمام شہر میں اس مجلس کا شہرہ ہو گیا اور مہینوں اس کا ذکر ہوتا رہا۔ میں نے یہ حال نواب بدحسن صاحب کی زبانی سن کر قلمبند کیا۔

میر انیس کی آخری مجلس

میر انیس نے ۷۲ برس کی عمر پائی۔ ۵۶، ۵۷ برس مشق فن میں گزرے۔ جوں جوں وہ بوڑھے ہوتے گئے ان کی شاعری جوان ہوتی گئی اور زمانے نے اول سے آخر تک ان کا احترام کیا۔ انہوں نے سینکڑوں مجلسیں پڑھیں اور ہمیشہ ارباب مجلس کی واہ واہ سبحان اللہ کی پرجوش آوازوں کی گونج میں منبر سے اترے۔

کہتے ہیں کہ میر صاحب مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے آخری مجلس نواب باقر علی خاں صاحب و نواب جعفر علی خاں صاحب کے شیش محل واقع لکھنؤ میں پڑھی۔ اس کے بعد پھر کسی مجلس میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس مجلس میں جو مرثیہ آخری مرتبہ پڑھا وہ یہ تھا ؎

آتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج

سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

میر مستحسن خلیق

میر انیس کے نامور والد بزرگوار اور میر حسن کے دوسرے فرزند میر مستحسن خلیق خاندانی شاعر تھے۔ کئی پشتوں سے شعر و سخن کے سلسلہ نے انہیں اپنے عہد کا نام بر آوردہ شاعر پیدا کیا۔ ان کے دادا میر ضاحک ہنس مکھ ظریف اور ہزل گوئی میں مشہور ہوئے۔ وہ دور کچھ اسی انداز کا تھا۔ ایک طرف سنجیدہ شاعری پنپ رہی تھی۔ حاتم، مصحفی، درد جیسے شاعروں کی شہرت تھی۔ میر تقی میر اور سودا کا مقابلہ۔ دوسری طرف میر جعفر زٹلی کی ڈگر آگے بڑھ رہی تھی۔ سودا، ضاحک، انشا، جرأت اور کبھی کبھی میر بھی ادھر آنکلتے تھے۔ حسن اتفاق کہ ضاحک کے فرزند میر حسن شستہ مزاج، نفیس طبع اور ذہنی و فطری طور پر جدید شاعری کے و... ... نکلے۔ ان کی غزل اور مثنوی عام طور پر سادگی اور روانی، تسلسل اور خلاقی اسلوب کی ترجمان ہوئی اور تکلف پسندی کے ماحول میں عوام نے اس انداز کو سراہا۔ پسند عام نے حسن کو مقبول شاعر قرار دیا ان کا یہ تجربہ ان کی اولاد کے لیے بہت سی فنی راہوں کے لئے کارآمد ثابت ہوا۔ میر حسن کے کم از کم تین فرزند تھے۔ خلق، خلیق اور مخلوق۔ ان میں سے خلیق کی شہرت اور سان کا دستیاب سرمایۂ فکر و فن گواہ ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر نیک مزاج، خوش فکر اور سادہ بیاں شاعر تھے۔

ولادت

میر مستحسن خلیق کی پیدائش دہلی میں ہوئی یا فیض آباد میں اور تاریخ ولادت ۱۱۸۱ھ ہے یا اس سے کچھ زیادہ آگے پیچھے؛ ان کے تذکرہ نگار معاصرین میں مصحفی سب سے پرانے بزرگ ہیں جو "تذکرۂ ہندی" کے مقدمے میں اس تالیف کا محرک خلیق کو بتلاتے ہیں۔ قرائن سے ثابت ہے کہ مصحفی نے یہ کام ۱۱۹۹ھ میں شروع کیا اور ۱۲۰۹ھ میں فراغت پالی۔ اگر مصحفی نے ۱۱۹۹ھ میں میر احسن خلیق کو انیس سال کا صحیح لکھا ہے تو ان کی تاریخ ولادت ۱۱۸۰ھ قرار پاتی ہے اور میر خلیق ان سے چھوٹے تھے گویا وہ ۱۱۸۱ھ یا اس کے بعد پیدا ہوئے اور تذکرہ کے وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہونا چاہیئے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ایک نوعمر بچے کی فرمائش کے احترام میں مصحفی جیسے بزرگ استاد نے کتاب لکھ دی۔ خلیق بچپنے سے ہونہار، ذہین اور خوبصورت تھے۔ فیض آباد میں تربیت و تعلیم پائی۔

شاعری

سولہ سال کے ہوئے تو موزونی طبع نے شاعری کی طرف قدم بڑھایا۔ ان دنوں مصحفی نئے نئے آئے ہوئے تھے۔ خلیق اپنے لئے سیدھے "درست" نادرست" شعر اپنے والد کی خدمت میں پیش کرتے اور میر حسن بیٹے کی پاس خاطر سے اصلاح دے دیتے تھے۔ لیکن اس کم سنی میں ذہنی بلندی کی نشان دہی ہوتی تھی۔ مصحفی نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ اگر زمانے نے فرصت دی تو خوب کہے گا۔ "ایام خوردی و کم سنی" کے اشعار ہیں:

جس گھڑی ہم کو نہیں پاتے ہیں ہم　　　جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم

سر جھکا لیتا ہے لالہ شرم سے   جب جگر کا داغ دکھلاتے ہیں ہم

اٹھارہ بیس برس کی عمر میں میر حسن نے اپنے ہونہار فرزند کو میاں مصحفی کی شاگردی میں دیا۔ مصحفی نے محبت و توجہ سے شاگرد کو رموزِ فن بتلائے۔ استادی کے نکتے سمجھائے۔

معلوم ہوتا ہے خلیق نے عنفوانِ شباب میں غزل میں مہارت پیدا کر لی تھی۔ ان کی طبیعت شگفتہ، خیالات نازک اور زبان صاف تھی، اس لئے شعروں میں رعنائی ہے۔ مصحفی نے دو غزلوں کے پانچ پانچ شعر، اور لالہ سری رام نے ایک اور غزل کے پانچ شعر نقل کئے ہیں۔ یہ سب نمونے یکسانیت اور فکری اسلوب کی وحدت ظاہر کرتے ہیں۔

اشک جو چشمِ خوں فشاں سے گرا   تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا
آتشِ گل پہ جل کباب ہوا   رات بلبل جو آشیاں سے گرا
شیشۂ دل تو چور ہو جاتا   کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا
میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو   پھول جو دستِ باغباں سے گرا
ہنس دیا یار نے جو رات خلیق   کھا کے ٹھوکر اس آستاں سے گرا

مصروفیات

مشرقی قدیم روایت کے مطابق جب تک شفیق باپ زندہ ہے بیٹے آزاد اور بے فکر زندگی گزارتے ہیں۔ پھر خلیق کی عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیق آزاد زندگی گزار رہے تھے پڑھنے کا وقت نہ تھا اور انہوں نے جم کر باقاعدہ اعلیٰ درجے میں تعلیم حاصل نہیں کی۔

۱۲۰۱ھ میں دس محرم کو میر حسن نے رحلت فرمائی اور خلیق پر نئی ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ نہ معلوم اس وقت تک ان کی شادی ہو چکی تھی یا نہیں مگر بھائیوں کے سہارے کوئی کب تک زندگی بسر کرتا ہے۔ "تذکرۂ ہندی گویاں" کے بقول خود خلیق نے کہا تھا کہ وہ کسی لشکر کے ساتھ بھی رہے اور کسی سفر پر گئے۔ گویا وہ سپاہیانہ صلاحیت اور فنونِ حربیہ سے باخبر تھے فوج میں نوکر بھی رہے۔

۱۲۰۹ھ میں نواب آصف الدولہ رام پور کی مہم میں مصروف تھے ممکن ہے خلیق بھی اس فوج میں کسی اسامی پر نوکر ہو گئے ہوں۔ لیکن سیاسی طور پر انگریزوں نے امدادی فوج کا ایسا منصوبہ بنا لیا تھا جس نے ملک کی ریاستوں سے فوجی تنظیموں کا خاتمہ کر دیا۔ اب ملک میں حکومت مقامی افراد کی تھی۔ مگر فوج انگریز بہادر کی۔ ممکن ہے اسی بنا پر خاص ہنگامی حالات کے بعد فوج میں تخفیف ہوئی ہو اور خلیق نے تلوار رکھ کر قلم اٹھا لیا ہو۔

مولانا محمد حسین آزاد کے بقول میر خلیق نیشاپوری خاندان یعنی مرزا احمد تقی ترقی کے یہاں پندرہ روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔

فیض آباد میں محاورات زبان کا بھی ایک محکمہ تھا۔ خلیق کا مکان اور میر حسن کا گھر اب تک بڑے بوڑھوں کے بقول نواب بہو بیگم صاحبہ کے محل کے قریب موجود ہے۔ کیا بعید ہے میر خلیق اس دفتر میں بھی کام کر چکے ہوں۔

خلیق پختہ عمر ہو چکے تھے۔ فیض آباد میں ان کا شمار اچھے غزل گو اور استادوں میں ہونے لگا۔ نواب سید محمد خاں رند اور میر اوسط علی رشک جیسے متعدد شعرا ان کے شاگرد ہو چکے تھے۔ مرزا محمد تقی خاں ترقی کے دولت خانے پر مشاعرے ہوتے تھے۔ اہل کمال دادِ سخن دیتے تھے۔ ان مشاعروں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ فیض آباد میں میر خلیق سے بہتر کوئی شاعر نہیں۔

۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۴ء کے لگ بھگ میر انیس کی ولادت ہوئی۔ معلوم نہیں انیس سے پہلے کوئی اولاد ہوئی یا نہیں انیس و مونس ان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ محمد تقی صاحب اور مختلف عمائد شہر اور شاگرد اُن کی خدمت کرتے ہوں گے۔ نواب بہو بیگم صاحبہ کا دربار قائم تھا۔ ان کی سرکار سے فیض آباد کی رونق و عظمت برقرار تھی۔ ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۴ء میں نواب امۃ الزہرا بہو بیگم نے رحلت فرمائی۔ وابستگانِ دولت کی بساط الٹ گئی۔ فیض آباد کا سہاگ اجڑ گیا۔ لوگ جوق در جوق لکھنؤ منتقل ہونے لگے۔ نوجوان شعرا بھی لکھنؤ چلے گئے۔ رند نے خلیق کو چھوڑ کر آتش سے اور رشک نے ناسخ سے اصلاح لینا شروع کی اس افراتفری میں خلیق بھی بے وطن ہو گئے۔ یوں تو ان کا گھر گلاب باڑی ہی میں تھا مگر ان کی آمد و رفت لکھنؤ میں بڑھ گئی ممکن ہے دوسرے شہروں میں بھی آمد و رفت رہتی ہو۔ لکھنؤ میں ان کے دوست احباب تھے۔ فیض آباد کا ماحول تھا۔ ان کے پرانے کرم فرما اور شاگرد تھے۔ میر حسن کا گھر اور ان کی اولاد تھی۔ لہٰذا خلیق اپنے وطنِ ثانی میں زیادہ رہتے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں راجہ ٹکیت رائے کے خاندان میں بچوں کے اتالیق بھی تھے اور غالباً مفتی گنج والے مکان میں رہتے تھے۔ پھر موجودہ آغا میر کی ڈیوڑھی کے قریب محلہ سٹھی میں آ گئے تھے۔ (دیکھیے میرا مضمون "انیس کا تاریخی ماحول اور شخصیت" مطبوعہ ماہِ نو انیس نمبر ۱۹۷۲ء) مولانا آزاد کے اطلاعات یہ ہیں۔

میر خلیق نازک خیالیوں میں ذہن لڑا رہے تھے کہ باپ کی موت نے شیشے پر پتھر مارا جس نے آمد کے چشمے خاک ریز کر دیے مگر ہمت کی پیشانی پر ذرا بل نہ آیا۔ اکثر فیض آباد میں رہتے تھے۔ لکھنؤ آتے تھے تو پیر بخارا میں ٹھہرا کرتے تھے۔

پُرگوئی کا یہ حال تھا کہ مثلاً ایک لڑکا آیا، اس نے کہا۔ میر صاحب! آٹھوں کا میلہ ہے، ہم جائیں گے، ایک غزل کہہ دیجیے! اسی وقت ایک غزل لکھ دی۔ اس نے کہا۔ یاد بھی کروا دیجیے۔ میر صاحب اسے یاد کروا رہے ہیں۔ رواج کے مطابق غزلیں قیمتاً بھی کہتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی نے میر صاحب سے غزل لی اور ناسخ کے پاس جا کر کہا "استاد غزل پر اصلاح دے دیجیے۔" شیخ صاحب نے غزل پڑھ کر اس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا۔ <u>یہ تمہاری غزل ہے</u>؟ ہم زبان پہچانتے ہیں۔ یہ وہی <u>پیر بخارا والا</u> ہے۔ (آبِ حیات)

لکھنؤ کے ترقی پذیر معاشرے میں غزل کے شاعروں میں ایک ٹکڑی ایسی نکلی جو مشقِ سخن اور مہارتِ فن کے بعد مرثیے کی طرف مائل تھے۔ یہ لوگ قدردانی کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی شاعری کو مذہبی رشتے سے تقدس بھی حاصل ہوا۔ ظاہری احساسات اور مشاہدات میں کتنا ہی مقناطیس بھر دیا جائے اس کا مستقبل بہرحال فنا پذیر ہوتا ہے۔ بلطافی انسانوں کو پہاڑی مناظر اور

پہاڑیوں کے باشندوں سے میدانی حسن کی بات کہی تو جاسکتی ہے لیکن اثر میں یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ عقل وفکر کی شاعری ہر عقلمند کے لئے قابلِ توجہ رہتی ہے۔ عقل وفکر میں اگر عقیدے کو شریک کر لیا جائے تو فنون وتخلیقات میں وہ رس اثر آفرینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اودھ کی تہذیبی روایت دو پہلو رکھتی تھی۔ ایک دولت کی چمک دمک کے انعکاس سے جگمگاتا پہلو۔ تکلف، تصنع، نفاست اور نزاکت کا آئینہ دار۔ دوسرا علمی اجتہادی فکری اور اعتقادی پہلو ہے اس پہلو سے اودھ کی تہذیب، اسلامیانِ برصغیر کی تاریخ کا روشن پہلو تعمیر کرتی ہے۔ اعتقادی حیثیت ہے جو ثقافتی عام منظرِ عام پر آئیں وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار، اعلیٰ انسانی کردار، اعلیٰ نفسیاتی رجحانات اور اعلیٰ درجے کے ادب کے ترجمان قرار دیئے جاتے ہیں۔ ان کاموں میں "مرثیہ" کا بھی شمار ہے۔

آصف الدولہ کے بعد لکھنؤ میں مرثیے کی قدیم روایت نے عروج حاصل کیا۔ ناسخ و آتش کے معاصر شعراء میں جو اعزاز غزل گو اساتذہ کو حاصل تھا۔ اس سے زیادہ یا اس کے لگ بھگ اعزاز ان کے خواجہ تاش ضمیر (شاگرد مصحفی) کو حاصل تھا۔

گدا، احسان، افسردہ، آغا، افسر، فصیح، دلگیر اور ناظم صرف مرثیہ گو شاعر مانے جاتے تھے۔ میر مستحسن خلیق بھی مذہبی اور اخلاقی آدمی تھے، ان کے والد اور بھائی مرثیے لکھتے تھے۔ خلیق نے بھی لکھنؤ پہنچ کر مرثیے کا ماحول پسند کیا۔ انہوں نے غزل گوئی کو سلام کیا اور مرثیے لکھنے شروع کئے۔

خلیق کی مرثیہ گوئی

تاریخ مرثیہ گوئی کے قاری جانتے ہیں کہ "مرثیہ" کے اصطلاحی معنے اور اس کے مظہر بدلتے رہے ہیں۔ قطب شاہی و عادل شاہی دور کے مرثیے ہمارے دور کے سادہ نوحوں اور سلاموں سے ملتے جلتے تھے۔ اس زمانے میں غزل کی ہیئت کے علاوہ مثنوی کی تکنیک بھی پسند کی گئی۔ کم وبیش سو برس کے بعد یہ روایت دہلی میں آئی اور محمد شاہی دور میں "مرثیہ" تسلسلِ بیان اور ہیئتی رنگینیوں میں بدلا۔ سلام و غزل کی بناوٹ کے علاوہ مخمس، ترجیع اور ترکیب و مسدس کے انداز اپنائے گئے۔

حملۂ نادر شاہ کے بعد وہ ماحول بدلا اور اودھ میں مرثیہ گوئی شروع ہوئی تو میر و سودا، مسکین و سکندر، ندیم و مذنب دہلی سے لکھنؤ آئے اور ان لوگوں نے اپنی روایتی شان برقرار رکھی۔ زبان و بیان تو بدلا مگر ہیئت نہ بدلی۔ پچیس تیس برس بعد کچھ لوگوں نے شہرت و مقبولیت کے سہارے مسدس کی ہیئت مسلسل تجربے کرنے کے بعد اسے سکۂ رائج الوقت کا درجہ دیا۔

یہ مسدس سوز خوانی کے طرز پر پڑھے گئے اور سوز خوانی پسندِ عام ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد دینی حلقوں نے لَے اور سُر پر اعتراض کئے۔ سوز خوانی کو شرفاہت کے خلاف قرار دیا۔ اس لئے مرثیہ کی خوانندگی میں لَے اور سُر کو چھوڑ دیا گیا۔ ایک نیا انداز ایجاد ہوا۔ مرثیہ خواں نے خطابت اور تیور سے کام لے کر "تحت اللفظ" اصطلاح وضع کی۔ مرثیہ گو خود یا کوئی اور شخص مرثیہ ہاتھ میں لے کر منبر پر بیٹھتا اور افہام و ابلاغ و خطابت کے لہجہ میں مصرعہ مصرعہ ادا کرتا۔ لوگ داد دیتے اور درود کی جگہ درود پڑھتے بکا کی جگہ بکا کرتے تھے۔

عام طور سے مرثیہ تیس سے چالیس حد سے حد پچاس یا ان بند کا ہوتا تھا۔ انیس کی نوجوانی اور خلیق کے بڑھاپے میں جو لوگ اس طرز کے استاد تھے ان میں چند نام اب تک مشہور ہیں۔ مثلاً دلگیر، ضمیر و فصیح۔ میر مستحسن خلیق نے اسی ہیئت و اسلوب میں مرثیے لکھے اور پڑھے۔

خلیق کا امتیاز

ہم نے ان بزرگوں کے مرثیے دیکھے ہیں۔ ان میں زبان و بیاں کا ارتقا ہے۔ اظہار و ابلاغ کا حسن ہے شعر و فن کی استادانہ مرصع کاری ہے۔ مرزا دبیر کے چھوٹے مرثیے اس انداز کے کامل نمونے ہیں۔ خدا نے مرزا دبیر کو عروج بخشا۔ مرزا دبیر اس اسلوب کے آخری نمائندے تھے۔ وہ ضمیر کے شاگرد اور اس روایت کو آگے بڑھانے والے تھے۔ گدا، افسردہ، تشبیہ، ضمیر اور دلگیر بوڑھے ہو چکے تھے۔ مرزا دبیر ان بوڑھوں کی زندگی میں شہرت پاکر آگے بڑھ رہے تھے۔ لوگ ان کو بھول گئے اور مرزا دبیر کا مرثیہ دور دور تک پھیل گیا۔

خلیق بھی مختصر مرثیہ (مسدس) کے دورِ عروج میں منبر پر آئے۔ ان کی شاعری سادہ، مؤثر اور عام فہم تھی۔ اس پر ان کا پڑھنا بہت اثر آفریں ہوا۔ ضمیر کی ہم سنی اور مصحفی کی شاگردی نے دونوں کو آمنے سامنے کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے خلیق بڑے مرثیہ نگار اور مرثیہ خواں ہو گئے۔

خلیق نے بہت مرثیے لکھے فقط پروفیسر مسعود حسن ادیب کے پاس ان کے مرثیے سو سے زیادہ ہیں۔ لیکن جس طرح ضمیر کے بعد لوگ ضمیر کے جانشین دبیر کے پرستار ہو گئے تھے اور دبیر نے مختصر مرثیہ کی روایت آگے بڑھائی۔ اسی طرح خلیق کے جانشین میر انیس کے چرچے نے خلیق کو بھلا دیا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ میر مظفر حسین ضمیر نے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں مرثیہ میں بیانیہ اور بینیہ اور واقعاتی طریقِ اظہار میں جدت پیدا کی اور قدیم اسلوب میں اول و وسط میں اضافے کئے۔ تمہید اور تنوع جدید کے یہ ٹکڑے چہرہ، رخصت، سراپا، گریز اور رزم یا جنگ کی اصطلاحوں سے نامزد ہوئے۔

۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں میر خلیق کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی (وہ ضمیر سے تقریباً دس سال بڑے ہوں گے۔ دبیر اور انیس علی الترتیب بتیس اور چونتیس برس کے قریب تھے۔ ضمیر کی جدت کو خلیق تو کیا خود ضمیر بھی پوری طرح پروان نہ چڑھا سکے۔ اس کام کے لئے خدا نے انیس و دبیر کو پیدا کیا تھا۔ اور ان دونوں ہی نے نئی روایت کو فروغ دیا۔

خلیق کے وہ مرثیے جن میں چہرہ، آمد، سراپا، رجز، جنگ، سب اجزا ہوں اس وقت میرے سامنے نہیں۔ نہ خلیق کے مرثیوں کا کوئی ضخیم اور نمائندہ مجموعہ چھپا ہے۔ خلیق کے چند مرثیے چھپے اور نایاب ہو گئے۔ باقی ذخیرہ مخطوطوں کی شکل میں ہے۔ میرے پاس ان میں سے دو مرثیے ہیں اور میری حالیہ معلومات کی حد تک دونوں غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک مرثیہ ہے:

جب علم دار کو میداں کی اجازت نہ ملی

چالیس بندوں کا یہ مرثیہ اس ترقیمہ پر ختم ہوتا ہے۔

" بتاریخ سوم ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۰ھ ہجری روز دوشنبہ وقت شب از حکیم محمد علی صاحب مرثیہ گرفتہ نقل گرفتہ شد۔ امید کہ ہر کہ خواند برائے مغفرت کاتب الحروف کاظم علی از حق تعالیٰ (دعا) نماید در قصبہ پانی پت تحریر یافت فقط۔"

میر مستحسن خلیق نے ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں وفات پائی اور خواجہ مصاحب علی راوی نے تاریخ کہی تھی۔

میر خلیقِ نکتہ سنج دارِ فنا کو چھوڑ کر
خلق کے دل پہ کوہ غم اپنے الم کا دھر گئے
راوی خستہ حال نے فکر جو فرط غم سے کی
ہاتفِ غیب نے کہا " میر خلیق مر گئے"

(تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ج ۲ ص ۲۹۵)

اس بنا پر زیر نظر مخطوطہ میر صاحب کی وفات کے بیس برس بعد کی تحریر ہے۔ اس وقت انیس کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا اور خلیق کا مرثیہ لکھنؤ سے پانی پت تک سفر طے کر چکا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلیق کی شہرت لکھنؤ سے نکل کر دہلی اور دور دراز قصبوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ مجھے حکیم محمد علی اور کاتب مرثیہ کاظم علی کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

دوسرا مرثیہ بے تاریخ و بے ترقیمہ ہے۔ لیکن کاغذ، روشنائی اور کتابت دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ معاصر نسخہ ہوگا اور کیا بعید ہے کہ ۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ لکھا گیا ہو۔ کاتب خوش نویس اور کتابت ہموار و خوبصورت ہے۔ ہر صفحہ پر دو بند ہیں۔ لیکن صفحہ ۱۱، ۱۲ پر تین تین بند ہیں۔ نو ورق " اٹھارہ صفحے" پر مشتمل یہ مرثیہ محاکاتی انداز میں ہے۔ واقعہ یہ لکھا ہے کہ جناب قاسم کی عروسی ہوئی۔ وہ دولہا بن کر آئے تو ان کی دولہن نے کچھ غم انگیز باتیں کی ہیں۔ شہادت اور اپنی بیوگی پر اظہار غم کیا۔ پھر جناب نے اس کا جواب دیا۔ پھر رخصت طلب کی اور اپنی والدہ سے ملے، اجازت لی، میدان میں آئے، اور شہید ہو گئے۔ شہادت کے بعد جناب امام حسینؑ، پھر والدہ، دولہن اور بیبیوں کے بین لکھ کر مرثیہ ختم کر دیا ہے۔

مرثیہ میں سادہ واقعہ نگاری ہے۔ کوئی رنگینی نہیں۔ لیکن روانی، تسلسل، رقت انگیزی اور اختصار کیساتھ دلکشی قابل دید ہے۔ زبان میں زیادہ نکھار نہیں ہے۔ اسلئے گمان ہوتا ہے کہ شاید ابتدائی دور کی یادگار ہے۔ واقعہ میں صرف شاعری ہے۔ اس دور میں جنگ نامۂ قاسم، جنگ نامۂ محمد حنیفہ جیسے منظومات رائج تھے اور بعض چیزیں اب تک مل جاتی ہیں۔ یہ قصہ مرثیہ کا ایک موضوع اور جزو بن گیا ہے ہم اسے خلیق کے شاعرانہ نمونے کے طور پر دیکھتے ہیں اور کسی دوسری فرصت میں اس کے تنقیدی پہلو پر گفتگو کریں گے۔

—— اب آپ مرثیہ ملاحظہ کیجئے کہ انیس کے والد مرحوم کی یادگار اور انیس کے فنی پس منظر کا ایک جز ثیہ ہے۔

مرثیہ میر خلیق

قاسم بنا مسند پہ جب بن کے بنا بیٹھا اور شرم سے زانوں پہ سر اپنا جھکا بیٹھا
کہنے سے بزرگوں کے اک دم کو تو آ بیٹھا پر دل میں تھا جینے سے وہ ہاتھ اٹھا بیٹھا
سہرا تو پڑا منہ پہ پھولوں کا لٹکتا تھا
وہ چاڈ بھرا پھر پھر میدان کو تکتا تھا

نہ دست حنائی پہ دلہن کے نگاہ اس کی نہ جوڑے سہانے کی اپنے خوشی اس کو تھی
نہ دھیان یہ اس کو تھا ہوتی ہے مری شادی آنکھوں میں بھرے آنسو اور سانس ہر اک ٹھنڈی
ماں اس کو یہ کہتی تھی اے رشک قمر پیارے
دلہن کی طرف دیکھو، ہے دھیان کدھر پیارے

یہ بیبیاں جو اس دم بیٹھی ہیں تمہیں گھیرے ہر ایک کے دل اندر ارمان ہیں بہتیرے
مجھ ماندہ کے خالق نے صد شکر کے دن پھیرے جو شادی رچی تیری واری گئی میں تیرے
مہمانوں کو اے بیٹا کاہے کو کڑھاتے ہو
کیا دل پہ گزرتی ہے کیوں آنسو بہاتے ہو

دن بیاہ کے کوئی بھی اے لال ہے غم کھاتا زانوں پہ کوئی دولہا سر کو نہیں نہوڑاتا
حق تم کو نصیبوں سے یہ شادی ہے دکھلاتا جو بختوں سے ہوتا ہے دامادی کا بھی ناتا
پہلو میں جو یہ تیرے گھونگھٹ کئے بیٹھی ہے
یہ غیر نہیں بیٹا شبیر کی بیٹی ہے

جس طرح حسن کے تم خورشید درخشاں ہو ویسی ہی یہ مہ پارہ شبیر کی ہے دیکھو
نوبت کے بجنے کا ہے وقت کمر کھولو ہتھیار میں دھرا دوں صدقے گئی مجھ کو دو
میں آرزو اس دن کی اک عمر سے کرتی تھی
اس دن کے لئے بیٹا سب دکھ میں بھرتی تھی

چچیوں کو ہے یہ حسرت پھوپھیوں کو ہے یہ ارماں   جو آرسی مصحف تم دیکھو بہ لبِ خنداں
کیا ہر گھڑی پھر پھر کے تکتے ہو سوئے میداں   بھائی بھی سلامت ہیں اور عمو بھی میری جاں
وہ بات کہیں دل میں قاسم بنے مت لانا
اک رات کی دلہن کو جس میں پڑے غم کھانا

ماں بیٹوں کی یہ باتیں بنڑی نے سنیں جس دم   گھونگھٹ میں لگی رونے آہستہ بچشمِ نم
بانو ہوئی بنڑی کے احوال سے جب محرم   کہنے لگی اے دلبر! شادی میں یہ کیا غم
کیا بات ہوئی جس پہ بچی میری روتی ہے
پھٹتی ہے میری چھاتی کیوں جان یہ کھوتی ہے

اس لاڈلی نے میری کیا دیکھا ہے دنیا کا   جو دل پہ الم اس کے دن بیاہ کے یہ پہنچا
سمدھن نے کہا سنیو قاسم بنا کچھ بولا   ناداری کا یا طعنہ کوئی اسے دے بیٹھا
منہ سمدھنوں سے اپنا ہرگز نہ چھپاتی میں
پانی نہ ملا ورنہ شربت بھی پلاتی میں

پھر اس نے بلائیں لیں قاسم بنے کی آکر   اور کہنے لگی رو رو کر اس طرح بچشمِ تر
اس بیاہ سے آزردہ مت ہوجیو اے دلیر   سب دوں گی مدینے میں جو حق ہے ترا مجھ پر
یاں کیا کروں اے پیارے کچھ ہو نہ سکا مجھ سے
یہ ساس گئی صدقے تو ہو نہ خفا مجھ سے

پھر سر سے قدم تک وہ دلہن کی بلائیں لے   کہنے لگی کھول آنکھیں ماں تجھ پہ ہوئی صدقے
کس واسطے موتی سے ہیں آنسو پڑے بہتے   یہ رازِ نہاں اپنا اظہار تو کر مجھ سے
گر میری جدائی سے یا بہنوں کی، روتی ہے
چوتھی کو بلا لوں گی دو روز کو ہوتی ہے

بانو تو یہ بیٹی کو سمجھا کے گئی گھر کو   یاں بات ادھر سوجھی یہ قاسمِ بے پر کو
بس ہو چکی اب شادی خوش کر چکے مادر کو   دلہن سے ملے رخصت تو دیجے کٹا سر کو

جوں آئینہ مسند پر کس واسطے حیراں ہے
یہ بیاہ ترا اے قاسم اک خوابِ پریشاں ہے

اس وقت تو بیٹھے ہو تم مسندِ شادی پر اک آن میں میداں کی ہووے گی زمیں بستر
اس وقت تو ماں بہنیں بیٹھی ہیں ادھر اودھر اُس دم نہ کوئی ہوگا جس وقت کٹے گا سر
اس وقت ہیں سب ہنستے، تب ہر کوئی رووے گا
سر نیزہ پہ جاوے گا، تن خاک پہ سووے گا

دلہن سے کہا صاحب ادھر ذرا دیکھو تم میں رن کا مسافر ہوں رخصت مجھے اب دو تم
یہ صبر کی ساعت ہے اس وقت نہ رؤو تم جو مہر بندھا تھا سو دیسے مجھے بخشو تم
جو وصل تھا قسمت میں تقدیر نے دکھلایا
میداں سے مجھے بینے پیغامِ اجل آیا

اس بنڑی نے دولہا سے یہ بات سنی جس دم میں کیا کہوں اے یارو جو اس کا بنا عالم
ٹوٹا دلِ شاداں پر اس کے یونہی کوہِ غم آنکھوں سے بہا آنسو یوں بولی بچشمِ نم
جو کہتے ہو اس غم میں، میں دیر سے روتی ہوں
تھا دل کو یقیں میرے اب رانڈ میں ہوتی ہوں

پر بات مرے دل کی سن لیجئے اے صاحب نہ میں نے تمہیں دیکھا، نہ تم نے مجھے صاحب
یہ داغ رنڈاپے کا، گر دے کے چلے صاحب کچھ اپنی نشانی تو جاؤ مجھے دے صاحب
غم تو رہے گا ہر دم جی میرا جلانے کو
کچھ چاہیئے فرقت کی آتش کے بجھانے کو

پھاڑ آستیں قاسم نے دلہن کے حوالے کی کٹ بالوں کی نرجح اس نے اپنی بھی نشانی دی
مسند پہ کھڑے ہو جب مرنے پہ کمر باندھی دولہا کے بہے آنسو دلہن کو لگی ہچکی
قاسم نے سواری جو ڈیوڑھی پہ منگائی تھی
اس خانۂ شادی میں ہر سمت دہائی تھی

پھر ماں سے لگا کہنے ایک عرض مری مانو زہراؑ کی بہو ہو تم، زہراؑ کی قسم تم کو
میں مرنے کو جاتا ہوں تم دودھ مجھے بخشو رہنے کا نہیں اب میں تم بھی نہ مجھے روکو
تم دل میں نہ غم کھانا گو تم سے جدا ہوں میں
دلہن کو عوض اپنے یاں چھوڑ چلا ہوں میں

یاد آوے گی اے اماں جس وقت تہیں میری — چھاتی سے لگا لیجو یہ رانڈ دلہن میری
ماں رو رو لگی کہنے کیا کہتے ہو اے واری — اس دن کے لئے میں نے خدمت کی تھی تمہاری
جو آپ تو تم رن میں جا تیغ و تبر کھاؤ
اور رانڈ بہو میرے پہلو میں لگا جاؤ

زندہ رہو تم بھی اور دلہن بھی رہے جیتی — تم دونوں کی محشر تک توڑے نہ خدا جوڑی
پھولو پھلو تم دونوں ہے حق سے دعا میری — مجھ رانڈ کو لگ جاوے آئی ہوئی دونوں کی
بیٹا گیا جب مارا، ماں اُجڑی کا جینا کیا
دل چاک ہوا جس دم پھر زخم کا سینا کیا

جب شہر مدینہ میں تم چھوٹے تھے اے بیٹا — اور بیاہ کسی کے تھا فرزند کا جب ہوتا
میں کہتی تھی ہاتھوں کو تب سوئے فلک پھیلا — یہ دن مرے قاسم کو اللہ تو دکھلانا
سو بیاہ تو دکھلایا مجھ کو مرے داور نے
اب پوتے کی حسرت ہے، سو تم تو چلے مرنے

دُودھ آخرش اے یارو اس ماں سے وہ بخشا کر — میدان میں پہنچا اور تلواریں چلیں اس پر
تیغوں سے ہوا ٹکڑے جب اُسکا بدن یکسر — اور گر پڑا گھوڑے سے وہ ہو کے لہو میں تر
ہم رنگ تھا سب سہرا لوہو کی جو دھاروں سے
خوں نیچے ٹپکتا تھا مقیش کے تاروں سے

شبیرؑ نے آ رن میں رو رو کے یہ فرمایا — قسمت نے مجھے قاسم زخمی نہیں دکھلایا
یہ کہہ کے اٹھا اس کو جب خیمہ میں وہ لایا — مسند پہ لٹا اس کو، بھابی کو یہ سمجھایا
بے صبری سے قاسم کے لاشہ پہ نہ رونا تم
اُمت کی شفاعت کو مت ہاتھ سے کھونا تم

قاسم بنے کی ماں کو جب لاش نظر آئی — اور لہو لہان اس کی، شکل اس کی نظر آئی
یک بار پچھاڑ اس نے مائی کے اوپر کھائی — دلہن بھی اُلٹ گھونگھٹ سر پیٹ کے چلائی

اس رات کی بیاہی پر ٹوٹا جو رنڈاپا تھا
وہ چاند سا مکھڑا تھا اور خاک کا چھاپا تھا

گہہ لاش پہ قاسم کے قربان وہ جاتی تھی	گہہ لوہو بھرا سہرا آنکھوں سے لگاتی تھی
منہ ڈھانپ کے دامن سے گہہ آنسو بہاتی تھی	گہہ سائیں کو رو رو کر اس طرح سناتی تھی

یہ سوہا برن میرے تن پر سے اتروا دو
اک گیروی سی کفنی لا کر مجھے پہناؤ

ماں اس کی اسے کتنا کہتی تھی نہ رو بیٹی	قاسم نہ جئے گا اب تو جان نہ کھو بیٹی
ظاہر ہوا آخر وہ قسمت میں تھا جو بیٹی	تب اس سے یہ رو رو کر کہنے لگی وہ بیٹی

دن بیاہ کے جس اوپر یہ غم کا فلک ٹوٹے
اس رانڈ سے اے اماں رونا کہو کیا چھوٹے

اماں بنے قاسم کی ٹکراتی تھی سر اپنا	اور کہتی تھی کھو بیٹھی میں رشکِ قمر اپنا
کس طرح بڑھاپا اب ہووے گا بسر اپنا	تیغوں سے ہوا ٹکڑے جب لختِ جگر اپنا

پھر بولی کہ اے قاسم کس نیند ہو سوتے تم
نہ ماں کو تسلی دی نہ بنڑی سے بولے تم

جا خلد میں بابا کی چھاتی سے لگے اچھا	دکھ درد کی خدمت کو تم نے نہ مری سمجھا
جس جا رہو اے پیارے آباد رہو بیٹا	قسمت میں جو لکھا تھا مجھ رانڈ نے بھر پایا

بنڑی بھی بنی دیکھی بنڑا بھی بنا دیکھا
سہرا بھی ترا دیکھا لاشہ بھی ترا دیکھا

ماں اس بنی کی رو رو کرتی تھی ابھی زاری	اور بنڑی بھی سر اپنا پیٹے تھی بہت ماری
دیکھا جو سکینہ نے روتی ہے بہن پیاری	بہنوئی کے لاشے پر چلا اٹھی یک باری

کہنے لگی اے قاسم انصاف یہ کیسا ہے
تم بات نہیں کرتے روتی مری آپا ہے

کل مہندی تمہاری میں کس دھوم سے لائی تھی	اور کیسا خوشی ہو کر رنگ بہنی لگائی تھی
مصری مرے ہاتھوں سے جب آپ نے کھائی تھی	تب نیگ پہ جھگی تھی میں نے تمہیں بھائی تھی

اب کیا ہوا جو مجھ پر شفقت نہیں فرماتے
سالی سے نہیں دیکھا یوں دولہا کر پھر جاتے

گر نیند کے ماتے ہو ٹک بول کے سو رہیو بولو بھی نہ اے بھائی آنکھیں تو ذرا کھولو
اک نیم تبسم کی مشتاق ہے سالی تو الفت کی نظر سے پھر بہنا کو یہ سدری دیکھو

اس غم کی ستائی کو خوش وقت جو دیکھوں میں
دل شاد مرا ہووے اور تم کو دعا دوں میں

بانو نے کہا بیٹی ہے دھیان کدھر تیرا بہنوئی نے دانستہ منہ تجھ سے نہیں موڑا
قاسم نے تو جنت میں جا اپنا کیا ڈیرا یہ ڈھیر ہے ماٹی کا ہم رو چکے بہتیرا

سن کر یہ سکینہ نے منہ پیٹ لیا اپنا
اور حال برا اس نے رو رو کے کیا اپنا

جب خیمے میں رونے کا اک شور ہوا برپا عباس بھی اکبر بھی کرتے ہوئے واویلا
رونے لگے قاسم کے لاشے کے سرہانے آ تب کہہ کے یہ کبریٰ نے داماں سے منہ ڈھانپا

قاسم بنے کی میت میدان سے آئی ہے
میں تیری ہوئی بیوہ اے لوگو دہائی ہے

شبیرؑ نے آ جلدی اتنے میں بچشم تر قاسم کا اٹھا لاشہ میداں کو گئے لے کر
وہاں رکھ دیا لاشوں میں یہ کہہ کے زمیں اوپر اب سوئیو یہاں قاسم آرام سے تا محشر

وہاں بنڑی کے خیمے میں سب کوٹتے چھاتی ہیں
یاں تم پڑے سوتے ہو اور گرد براتی ہیں

یہ کہہ کے جو پھر آیا خیمے میں وہ بے چارا بیتاب و جگر تشنہ، آزردہ، فلک مارا
رونے لگا قاسم کو وہ فاطمہ کا پیارا اب آگے کہوں کیا میں لکھنے کا نہیں یارا

خوں ناب خلیقؔ اس دم ہر چشم سے جاری ہے
قاسم تو گیا مارا عباس کی باری ہے

ڈاکٹر سید عبداللہ

انیس کا غم

میں جس زمانے میں میر تقی میر کے المیہ مضامین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اہل نظر میں سے کسی کی یہ رائے میری نظر سے گزری کہ میر کا الم گہرا ہے اس لئے کہ وہ خود روتے ہیں اور اگرچہ انیس کے یہاں بھی الم ہے مگر ان کے غم کی حیثیت محض رلانے والے کی ہے اور کبھی کبھار خود نہ روتے ہوئے محض دوسروں کو رلانے والا الم کی اس سطح کا ترجمان نہیں ہوتا جس کی ترجمانی خود رونے والا کرتا ہے۔

بادی النظر میں یہ رائے قابل قبول ہی تھی قبول کر لی گئی۔ لیکن تفکر کی وسعت اور مطالعہ کی گہرائی اس پر آہستہ آہستہ معترض ہوتی گئی اور اس نے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ یہ رائے قابل بحث اور قابل ترمیم ہے۔ یہ رائے دراصل مرثیہ نگاری کے سرسری تصور کی وجہ سے قائم کی گئی ہے۔ چونکہ مرثیہ ایک مجلسی فن ہے اور اس کی غرض و غایت رلانا بھی ہے اس لئے خیال کر لیا گیا کہ دوسروں کو رلانے والا، ہر حال میں رلانے ہی سے غرض رکھتا ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی روتا ہو۔

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اب اگر سچ مچ مرثیہ رلانے کا ہی فن ہے تو اس سے متعلق کئی دلچسپ سوال خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً :-

(الف) کیا مرثیہ کسی المیہ احساس کے بغیر لکھا جا سکتا ہے ؟

(ب) کیا مرثیہ، مرثیہ نگار کے اپنے احساس الم کا ترجمان نہیں ؟

(ج) کیا مرثیہ نگار (مثلاً انیس) کے کلام کی نوعیت اور اس کے الفاظ کے اندر بولنے والی شخصیت اپنے مزاج کا راز اپنی لفظیات اور اپنے کلام کے دوسرے حصوں میں آشکارا نہیں کر رہی ؟

(د) کیا مرثیہ نگار کی مجلس آرائی محض تفریحی مشغلہ ہے یا اس میں اس کے کاروبار الم کو بھی کچھ دخل ہے ؟

یہ سب بحثیں فن مرثیہ کی ماہیت سے متعلق ہیں اور ان پر نامور اہل علم قلم اٹھا چکے ہیں لیکن ہنوز یہ معاملہ (کم از کم میری رائے میں) تشنۂ بحث ہے۔ یہ اس لئے کہ مذکورہ اہل علم حضرات کی ساری تنقید یا محاکمہ بعض مغربی اصناف کے معیاروں کے حوالے سے ہیں۔ مثلاً بعض ناقدین نے مرثیہ میں رزمیہ کی جستجو کی ہے۔ بعض نے اس پر ٹریجڈی کا سراغ لگایا ہے۔ بعض اور ہیں جو اسے محض بیانیہ کہہ کر، اس کو خطابت یا نری توصیف نگاری میں شامل کر رہے ہیں اور ایک حد یہ ہے کہ مرثیہ ایک فرقہ کی مذہبی شاعری ہے۔

یہ ساری پریشان خیالی اس لئے ہے کہ ہم اپنی اصناف سخن کو اپنی تہذیب اور اپنی روحانی روایتوں سے جدا کر کے

ان کی تعبیر مغربی روایتوں کے حوالے سے کرنے لگتے ہیں۔ صحیح موقف یہ ہے کہ مرثیہ صرف مرثیہ ہے اور مرثیہ لکھنے والا اصلاً غمِ اہلِ بیت کو ذاتی الم کا وجود دے کر اس الم کی تشریح نگاری کرتا ہے۔ اس نوعیت کے ذاتی احساسِ الم کے بغیر مرثیہ لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ بلکہ یہ کہنا بھی درست ہی ہوگا کہ اس نوعیت کے احساس کے بغیر مرثیہ نگار اپنا مرثیہ اہلِ مجلس کو سنا بھی نہیں سکتا ورنہ ایک عام مرثیہ خوانی اکر اور مرثیہ نگار سنانے والے کے درمیان کچھ بھی فرق نہ ہو۔

مرثیہ نگار محبتِ اہلِ بیت میں سرشار تو ہوتا ہے اور اس میں تمام محبانِ اہلِ بیت برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن ہر محبِ اہلِ بیت مرثیہ نگار نہیں ہوتا ...... سچی مرثیہ نگاری الم کے ذاتی احساس اور المیہ تجربے کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اس سلسلہ میں کچھ غلط فہمی مرثیہ کی وصف نگاری اور خارجی جزئیات نگاری کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خارجی جزئیات نگاری سے الم کی نفی کیونکر ہوئی۔ الم تو مرثیہ کی نہاد میں ہے اور اچھے مرثیہ نگار اپنے المیہ احساس کی اس طرح تہذیب و تطہیر کر لیتے ہیں کہ وہ الم ایک تہذیب، ایک سلیقۂ حیات بن جائے اور اسے سلیقۂ حیات بنانے کے لئے وہ اس میں ان عناصر کو بھی داخل کر دیتے ہیں جن کا ذکر انیس نے خود کیا ہے اور کہا ہے۔

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو

اور بقول انیسؔ مرثیہ کا میدان ہر دوسرے میدان سے مختلف ہے۔

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا

انیسؔ نے زخموں کا یہ گلستان اگایا ہے مگر اس کو "خون کی ہولی" نہیں بنایا۔ اسے سلیقہ مند مہذب آدمی کے لئے گوارا بھی بنایا ہے۔ اس میں صنعت بھی لائے ہیں، لب و لہجہ بھی ہے، متانت بھی ہے، روزمرہ بھی ہے، سلاست بھی ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا دبدبہ اور توصیف بھی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود مرثیہ کے ان عناصرِ ترکیبی میں یہ ایک عنصر کہ

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

اور مرثیہ تو ہے ہی کاروبارِ دردمندی اور ایک منفرد صنف ہے جس کی مثال دنیا کی کسی شاعری میں نہیں ہے ...... یہ بات بنیادی اور مرکزی ہے کہ درد کی کہانی لکھنے والے کو پہلے خود دردمند بننا پڑتا ہے یا وہ دردمند ہوتا ہے جو حضرات مرثیہ کو رزمیہ یا المیہ کہتے ہیں وہ مرثیہ سے یوں بے انصافی کرتے ہیں کہ مرثیہ المیہ اور رزمیہ سے اپنی سرشت، مزاج اور غایت کے اعتبار سے متضاد نہ بھی ہو تو بھی مختلف صنف ضرور ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ رزمیہ میں الم کی حیثیت کیا ہے؟ دنیا کے جتنے اہم رزمیے ہیں ان کے نصب العین اپنی بنیادی تحریک کے مطابق مختلف ہیں۔ کسی کا مقصد مذہب کی تقدیس و تمجید ہے، کسی کا مقصد وطن کی عظمت، کسی میں قوم کے

عنفوان شباب میں، کسی نازک کشمکش موت وحیات میں قومی احساسات کا پیکر بن جانے والا ہیرو مرکز ہوتا ہے اور اس کے بہادرانہ کارنامے موضوع توجہ ہوتے ہیں۔ کسی میں رومانٹک نصب العین ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں رزمیہ، کسی صورت حال کی عکاسی کے باوجود مقصد کے لحاظ سے شجاعت اور ولولہ عمل کی ــ نہ کہ المیہ صورت حال کی ترجمانی کرتا ہے۔ رزمیہ کسی قوم کے اوّلین ادبی مظاہر میں نمودار ہوتا ہے اور معیاری مرثیہ نگاری، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں شاعری کی منزل کمال میں چمکی۔

تو کہنا یہ ہے کہ مرثیہ میں درد اور رقت مرکزی عناصر ہیں اور رزمیہ میں جوش اور ولولہ انگیزی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

المیہ (ٹریجڈی) کے بارے میں بھی کچھ غلط فہمی ہے .... المیہ میں (اس میں شبہ نہیں کہ) المیہ احساس اور المیہ صورت حال، دونوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن کش مکش کے جو تجربات ٹریجڈی کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں وہ مرثیہ میں اگر تسلیم کر لئے جائیں تو مراثی کے رجال کی شان میں گستاخی سے کم نہیں اور مرثیہ کے مقصد سے سخت زیادتی ہے۔ المیہ ہیرو کے بارے میں ارسطو نے ہیرو کی اتفاقی غلطی (Hamartia) کا جو تصور پیش کیا ہے اگر اسے اساس کار مانا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل بیت عموماً اور امام حسینؑ خصوصاً ایسی کسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ان کی شہادت تو ایک اولوالعزم انسان کے مجاہدانہ عزم کی آئینہ دار ہے اور اس میں اتفاقی غلطی کا کوئی پہلو نہیں ...... نہ یہ مافوق الفطرت قوتوں سے مقابلہ تھا۔ یہ تو ایمان کا انکار سے مقابلہ تھا اور بالارادہ تھا۔ حضرت امام حسین کا عمل (hubris) غرور نفس کی بنا پر بھی نہ تھا بلکہ پورے اطمینان نفس کا آئینہ دار تھا۔

بعض جدید نقادوں نے ٹریجڈی میں متخاصب قوتوں کی باہمی کش مکش کو خیر و شر کا محاربہ کہنے سے احتراز کرتے ہوئے اسے دو (goodness) عظمتوں یا رفعتوں کا مقابلہ کہا ہے۔ ظاہر ہے کسی اور جگہ یہ نظریہ ٹھیک بھی ہے تب بھی کش مکش المیہ میں یہ ایمان و انکار ہی کا مقابلہ تھا۔ دو رفعتوں کا مقابلہ نہ تھا۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ مرثیہ پر گفتگو کرنے والے ایپک اور ٹریجڈی کے چکر میں پھنس کر مرثیہ کی ماہیئت کے بارے میں خبط مطلب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جب مرثیہ نگار کو المیہ نگار یا رزمیہ نگار سمجھ کر اسے اوروں کو رلانے والا قرار دیتے ہیں تو وہ مرثیہ نگار کی بنیادی نفسیات اور بنیادی تحریک سے بے خبری کا ثبوت دیتے ہیں۔

یہ ساری بحث بعض اہل الرائے کے اس خیال کی تردید میں ہو رہی ہے کہ انیس خود نہیں روتے بلکہ اوروں کو رلانا خوب جانتے ہیں۔ تردید یہ ہے کہ انیس اوروں کو رلانے سے پہلے خود بھی روتے ہیں ورنہ اتنے عالی مقام مرثیہ نگار کیسے ہوتے؟

انیس غم کے ان تمام مدارج سے باخبر ہیں جو انسانوں کو مختلف حالتوں میں پیش آتے ہیں۔ بچے کا غم، ماں کا غم، بہن کا غم، بھائی کا غم۔ غرض غم کی ہزار ہا صورتیں انیس کے کلام میں ہیں۔ ذاتی شعورِ غم کے سوا ان صورتوں کی توصیف کس طرح ممکن

باقی صفحہ ۴۱ پر

سید نصیر امام نصیر دہلوی

انیسؔ یعنی مرثیہ

انیسؔ کو مرثیے سے وہی نسبت ہے جو باغ کو بہار سے، گل کو بُو سے، جسم کو روح سے، مکان کو مکین سے، بیان کو ندرت سے، کلام کو فصاحت سے، عشق کو حسن سے، الفاظ کو معانی سے، دماغ کو فکر سے، لازم کو ملزوم سے۔ خدا جانے کیوں لفظ "مرثیہ" بغیر انیس کے کچھ غیر مانوس بلکہ لغتِ غریب سا معلوم ہوتا ہے۔ اُدھر ذہن میں لفظِ مرثیہ آیا اور ادھر بے تحاشا انیسؔ کا نام زبان پر آیا۔ حالانکہ لاتعداد مرثیہ گو ہو گزرے اور آج بھی ہیں۔ غالباً ہر صاحبِ ذوق اور سخن فہم کی یہی کیفیت ہوا۔ شبلی ہوں یا حالی، آزاد ہوں یا چکبست، آخر کیوں؟ جی چاہتا ہے کہ اس کا کچھ تجزیہ کیا جائے چنانچہ اس سلسلے میں مرثیے کی تاریخ

بقیہ صفحہ ۴۰ :- ہو سکتی ہے۔ وہ اپنا غم بھی جانتے ہیں اور دوسروں کے غم کی کیفیتوں سے بھی باخبر ہیں۔ انیسؔ، میر تقی میرؔ کی طرح صیغۂ واحد متکلم میں اس لئے فریاد کناں نہیں ہوتے کہ مرثیہ کا مخاطب جدا ہے۔ یہ فن غیر شخصی ہے جس میں خارجی جزئیات کی فراوانی ہوتی ہے ...... یہ دوسرے کے غم کی کہانی ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں مرثیہ نگار کا ذاتی الم تہہ میں کام کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر یہ ایک مرثیہ ہی دیکھئے جو "بلبل ہوں بوستانِ شہ تاجدار کا" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی تمہید میں انیس کے شخصی غم انگیز لہجہ کی پوری نمود ہے اور اس کے سوا کیا ثبوت مطلوب ہے کہ

"گل چیں نسیمِ غم ہو، الم باغباں بنے"

پورا بند پڑھنا ہو تو پڑھیے :-

آئے خزاں گلوں پہ تو ہو پھر بہارِ غم　　تازہ ہوائے آہ سے ہوں برگ و بارِ غم
داغوں کے گل کھلیں تو گلوں میں ہوں خارِ غم　　آنسو بہیں تو پھولے پھلے شاخسارِ غم

انیس کے کلام میں زخموں کے جو گلستان کھلے ہیں وہ زخم اہلِ بیت کے بھی ہیں.... اگر ان کے پردے میں ان کے اپنے دل کے زخم بھی صاف نظر آتے ہیں... ان کے سلام اور ان کی رباعیات و قطعات میں بھی یہ گلشن کھلے ہوئے ہیں اور مراثی کے بیانیہ و توصیف و تمہیدات میں بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میر تقی میرؔ رو کر اوروں کو صرف رلانا ہی جانتے ہیں، انیسؔ روتے اور رُلاتے بھی ہیں، مگر اسطرح کہ رونے والا "محظوظ" بھی ہو سکتا ہے... اور یہ حظ اس تہذیبِ غم سے پیدا ہوتا ہے جس نے انیسؔ کے مرثیوں کو دنیا کی شاعری میں ایک منفرد اور برتر مقام عطا کیا ہے۔

پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ہوگی تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مرثیہ انیسؔ کو کس مقام پر ملا اور انہوں نے اسے کس منزل پر پہنچا دیا۔ یوں تو مرثیے کی ابتداء عرب سے ہوئی، خود مرثیہ عربی لغت ہے۔ اہل عرب نے معرکتہ الآرا مرثیے لکھے۔ اس کے بعد ایران میں مرثیے کثرت سے لکھے گئے۔ ہندوستان میں ایرانیوں کی آمد کے ساتھ مرثیہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ دکن میں بہمنی دور حکومت میں عموماً اور احمد شاہ بہمنی ۱۴۲۲-۱۴۳۶ء کے عہد میں خصوصاً جب کہ سردار، امراء اور اہل دربار میں ایرانیوں کی کثرت ہوگئی تو مرثیہ گوئی کو بھی عروج ہوا۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور کی ریاستیں خود مختار ہوگئیں لیکن وہاں کے فرماں روا مرثیہ گوئی کے دلدادہ تھے۔ خود محمد علی قطب شاہ نے بھی مراثی لکھے۔ ملا وجہی نصرتی اور دیگر متعدد حضرات مرثیے لکھتے رہے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ پر ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن عزاداری اور مرثیہ نگاری میں فرق نہ آیا۔ شمالی ہند میں ہمایوں کے عہد میں مرثیہ گوئی کی ابتداء ہوئی۔ مسکینؔ۔ حزینؔ۔ یکتاؔ۔ ندیمؔ۔ فضلیؔ کے مراثی مقبول عام تھے۔ ۱۷۲۲ء میں برہان الملک سعادت خاں نے اودھ کی صوبہ داری سنبھالی یہاں مرثیہ گوئی اودھ کی تہذیب میں رچ بس گئی۔ اس وقت تک جس قدر مراثی لکھے گئے وہ مربع تھا۔ یعنی چار مصرعوں کے بند کی صورت میں۔ حیدریؔ۔ گداؔ۔ افسردہؔ۔ احسانؔ۔ سکندرؔ۔ میرؔ۔ سوداؔ نے مرثیے لکھے۔ ان کا مقصد واقعات کربلا کو نہایت سادگی سے نظم کر دینا تھا۔ تاکہ مجالس عزا میں سامعین گریہ و بکا کریں۔ اب تک مراثی میں توجہ نہ محاسن سخن کی طرف ہوئی نہ صنعتوں کی طرف۔ کوئی خاص ترتیب و ترکیب بھی نہ تھی۔ مرزا رفیع سوداؔ اور بقول میاں سکندر لاہوری نے مراثی بصورت مسدس لکھنے شروع کئے۔ لیکن نظریہ بعینہٖ وہی رہا۔ جستہ جستہ واقعات کربلا اسی سادگی کے ساتھ بجائے مربع کے مسدس میں نظم ہونے لگے۔ اتنا ضرور ہوا کہ بیان میں قدرے وسعت اور روانی پیدا ہوگئی۔ اور بس یہاں تک کہ فصیحؔ، دلگیرؔ، ضمیرؔ اور خلیقؔ افق مرثیہ نگاری پر نمودار ہوئے۔ عام طور پر یہی کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ میر ضمیرؔ نے مرثیے کی نوعیت یکسر بدل کر اسے ایک فن کی صورت دی۔ اس کے باقاعدہ اجزاء متعین کئے جو چہرہ۔ گریز۔ سراپا۔ رخصت آمد۔ رجز۔ جنگ۔ شہادت۔ بین اور دعا پر مشتمل تھے۔ لیکن قرینہ بھی یہی کہتا ہے اور اندازہ بھی یہی ہوتا ہے کہ مرثیے کو فن کی صورت دینے کا سہرا تنہا میر ضمیرؔ کے سر نہیں بلکہ مندرجہ بالا ہر چہار حضرات کی متفقہ سعی و کاوش کا نتیجہ تھا۔ بہر طور واقعہ جو بھی ہو یہاں پہنچ کر مَنْ بَكٰى عَلَى الْحُسَيْن الخ کے تحت لکھے جانے کے علاوہ ایک فنی صورت اختیار کر گیا۔ اسے بہت وسیع میدان ملا۔ قصیدے اور مثنوی کی اکثر خصوصیات کو اپنانے کے بعد مرثیہ ایک وقیع صنف شاعری نظر آنے لگا۔ اب ہر شاعر مرثیہ گو نہ رہا بلکہ مرثیہ گو حضرات کا ایک خاص مقام ہوگیا۔ سامعین کا رجحان بھی بدلا۔ اب وہ اسی طرح تنقیدی نوعیت سے مرثیہ سنتے، جیسے مشاعروں میں غزلوں کو سنا جاتا ہے۔ اسی طرح موقع بہ موقع داد بھی دی جانے لگی۔ اگرچہ حصول ثواب و مآل کار کی نوعیت اپنی جگہ برقرار رہی۔ اس صورت حال نے مرثیہ گو حضرات کی بڑی ہمت افزائی کی۔ اب وہ پوری کاوش و فکر سے مرثیے لکھنے لگے۔ فصیحؔ، دلگیرؔ، ضمیرؔ اور خلیقؔ اس میدان میں پیش پیش تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ فصیحؔ و دلگیرؔ عازم حج بیت اللہ ہوئے اور پھر واپس نہ ہوئے۔ اب اس میدان میں ضمیرؔ و خلیقؔ رہ گئے۔ ضمیرؔ زبان روزمرہ اور محاورے میں خلیقؔ کے دوش بدوش

نہ چل سکے۔ کیونکہ میر مستحسن خلیق اعدان کے والد میر غلام حسن حسنؔ فیض آباد میں بہو بیگم کی سرکار میں بیگماتی زبان و محاورے کے محافظ رہے اور یوں ٹکسالی زبان پر کما حقہٗ عبور کی سند پائی۔ گو ضمیرؔ و خلیقؔ کی توجہ محاسن سخن پر بھی رہی۔ لیکن صنعتوں کا اشعار میں برتنا ایک قیامت ہے۔ اگر کوئی صنعت یا محاورہ کسی شعر میں بے ساختہ آجائے تو شعر زمین سے آسمان پر پہنچ جاتا ہے لیکن اگر آورد ہے تو وہ شعر کے حسن کو خاک میں ملا دیتی ہے اور اس کی نوعیت محاسن سخن کے بجائے معائب سخن کی ہو جاتی ہے۔ تشبیہ و استعارے کی راہ بھی بڑی سنگلاخ ہے تشبیہ کی موزونیت۔ غیر حسی کے بجائے حسی ہونا تشبیہ ناقص کے بجائے تشبیہ کامل ہونا وغیرہ متعدد قیود ہیں۔ چنانچہ باوجود سعی بلیغ کے یہ دونوں حضرات۔ انیسؔ و دبیرؔ کا سا مقام حاصل نہ کر سکے۔ خلیق اگرچہ انیس کے والد ماجد تھے لیکن بصد احترام مؤدبانہ یہی کہنا پڑے گا کہ " آنچہ پدر نتواند پسر تمام کند، چند صلاحیتیں وہبی ہوتی ہیں اور کچھ اکتسابی اور یہ ایک آفاقی صداقت ہے کہ اکتسابی صلاحیتیں وہبی صلاحیتوں کے سامنے گرد ہوتی ہیں

جیسے فطری شاعر کے سامنے کبھی غیر فطری شاعر کا چراغ نہ جل سکا۔ آمد اور آورد کا فرق ارباب نظر اور سخن فہم حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ اگرچہ ضمیرؔ و خلیقؔ کی مرثیہ گوئی میں کاوش سعی مشکور تھی دونوں گو فطری شاعر تھے لیکن ہنوز دلی دور است، کا معاملہ تھا انیس کو مرثیہ اس مقام پر ملا۔ چنانچہ اب افق مرثیہ نگاری پر آفتاب عالمتاب طلوع ہو گیا جس ماہ و انجم ماند پڑ گئے۔ میر امی کا خاندان بھی کیا ہمہ آفتاب تھا۔ میر غلام حسین ضاحک ہجو کے بادشاہ ہوئے۔ ان کے فرزند میر غلام حسن حسنؔ نے مثنوی سحر البیان لکھ کر مسحور کر دیا۔ ان کے فرزند میر مستحسن خلیقؔ نے مرثیہ نگاری کو چار چاند لگا دیئے۔ اب یہ سلسلہ ان کے فرزند میر ببر علی انیس کے سامنے آئی مرثیہ نگاری ایک خاکہ تھی جسے انیس کے موئے قلم نے ایک جیتی جاگتی بولتی تصویر بنا دیا یا ایک جسد بے روح تھا جس میں خدائے سخن نے روح پھونک دی۔ انیس نے درگاہ رب العزت میں جو دعا کی۔ اس میں مرثیہ گوئی کے سلسلے میں اپنی طرف سے سب کچھ مانگ لیا اور پھر اس ادا سے مانگا کہ خلاق عالم نے نہ صرف وہ سب ہی عطا فرما دیا جو کچھ مانگا تھا بلکہ خزانہ قدرت سے وہ بھی بخش دیا جو مانگنے سے رہ گیا تھا کیوں نہ ملتا ذرا مانگنے کے تیور تو دیکھئے۔

یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر — اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر — گم نام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری — بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری — پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت مری اس طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

یہ خدائے سخن مرثیہ گوئی میں ہر صفت موصوف ہے۔ سادگی کا یہ عالم کہ ہر ہر مصرعہ سہل ممتنع جو نظم ہے وہی نثر۔ معانی کا یہ عالم کہ معلوم ہوتا ہے۔ ترشے ہوئے الفاظ کا ایک بحرِ ناپیدا کنار پڑا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ قاآنی روانی میں منفرد سمجھا جاتا ہے لیکن انیس روانی میں قاآنی سے بیس ہی ہیں انیس نہیں۔ زبان گھر کی لونڈی ہے۔ روزمرہ اور محاورے پر مکمل عبور و قدرت ہے۔ جہاں کوئی صفت آگئی بالکل بے ساختہ۔ تشبیہات اور استعارات اس قدر لطیف کہ طبیعت وجد کرنے لگے۔ فدا رزمگاہ میں تلوار کا چلنا ملاحظہ ہو۔ کس بلا کی روانی ہے، صفتوں، تشبیہوں اور استعاروں کی کیا بہار ہے اور منظر کشی کا کیا عروج ہے۔

افلاک پہ چمکی کبھی سر پر کبھی آئی کوندی کبھی جوشن پہ سپر پر کبھی آئی
گھر کر گئی سینے پہ جگر پر کبھی آئی تڑپی کبھی پہلو میں۔ کمر پر کبھی آئی
طے کر کے پھری کونسا حصہ تھا فرس کا
باقی تھا جو کچھ کاٹ وہ حصہ تھا فرس کا

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی نظر آئی ندی اُدھر اک خوں کی ابلتی نظر آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی نظر آئی پی پی کے لہو لال اگلتی نظر آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر نہ کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سر پٹکے تو موج اس کی روانی کو نہ پہنچے قلزم کا بھی دھارا ہو تو پانی کو نہ پہنچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہنچے خنجر کی زبان تیز زبانی کو نہ پہنچے
دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اس کی بڑی تھی
برچھی تھی، کٹاری تھی سروہی تھی چھری تھی

موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی دم خم بھی لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی امرت بھی ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی
کیا صاحب جوہر تھی عجب ظرف تھا اس کا
موقع تھا جہاں جس کا وہیں صرف تھا اس کا

"موقع تھا جہاں جس کا وہیں صرف تھا اس کا" یہ انیس نے تلوار کے متعلق کہا اور میں ان کے ہر مصرع کے ہر ہر لفظ کے لئے یہی کہتا ہوں جس لفظ کا جو محل ہو وہیں صرف ہوا ہے۔ الفاظ اگر برمحل صرف ہو جائیں تو جادو کا اثر رکھتے ہیں انیس کے مراثی میں مختلف کردار اور لاتعداد مختلف مواقع ہیں، لیکن ہر کردار اور ہر موقع کے لئے وہی لفظ صرف ہوا ہے جو معلوم ہوتا ہے وہیں کے لئے وضع ہوا ہے۔ اس ساحرِ اعظم اور مرقع کار کی کوئی پناہ ہے۔ پھر فطرت و جذباتِ انسانی

کا اس قدر گہرا مطالعہ اس پر زبان و بیان وہی جس کے وہ متقاضی۔ محبت، شفقت۔ ماں کا عشق کا فرق واضح اور نمایاں، نفرت، حسد، طمع، حقارت، سخاوت، شجاعت، ندامت، غصہ، قہر، دبدبہ، رعب، ایثار، حیا، مہر و وفا، صدق و صفا، مکر، ریا غرض ان گنت جذبات کا ایک محشر عظیم ہے گر واہ رے عبور و قدرت کہ کیا مجال کہیں ذرا سا جھول آجائے، ادنیٰ سی لغزش ہو جائے مکالمہ نگاری میں بڑے بڑے مشاہیر و ممتاز اہل قلم نے شرمناک ٹھوکریں کھائی ہیں اور یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے۔ اکثر و بیشتر کردار کے منہ سے خود مکالمہ نگار بولتا نظر آتا ہے۔ یہ شرف بھی صرف انیس کو ہی حاصل ہے کہ اس قدر مختلف کرداروں کی گفتگو ان کی ہی زبان میں ہے۔ جنس، منصب، سن، صنف، قرابت، حفظ مراتب، موقع محل غرض ہر شے پر نظر ہے۔ دیکھئے ایک کس قدر نازک مقام ہے اور انیس کیسے معجزانہ طور سے طے کر جاتے ہیں۔ اعجاز سخن ہے۔ شہنشاہ کربلا اپنی سپاہ کے علمبردار کا تعین فرمانے والے ہیں۔ سب اس منصب جلیل کے لئے بے تاب و بے قرار ہیں۔ جناب زینب کے دونوں نو عمر نونہال بھی ہیں ذرا تیور ملاحظہ ہوں۔

گردانے دامنوں کو قبا کے، وہ گلعذار — مرفق تلک آستینوں کو اُلٹے بصد وقار
جعفر کا رعب، دبدبۂ شیرِ کردگار — بستے سے ان قدوں پہ نمودار و نامدار
آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانبِ علم — نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہِ امم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم — آہستہ پوچھنے لگے اس سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علیؑ ولی کے نشان کا
اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہِ خوش خصال — ہم بھی بجا ہیں آپ کو اس کا رہے خیال
پاسِ ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال — اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے امیدوار ہیں۔

زینب نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام — کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام — بگڑوں گی میں جو لوگے علم کا زباں سے نام
رجاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

اب ذرا دیکھئے انیس کی جذبات شناسی۔ جناب زینب نے اپنے بچوں کی تادیب تو کی مگر آخر ماں ہیں۔ اب گفتگو کا

رنگ ہی بدل گیا۔ شفقت مادری اڑ گئی۔ اب وہ ایک ماںتا کی ماری ماں ہیں۔

سرکو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس　　ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس　　بس قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے تم جو بُرا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوسِ منصبِ جلیل　　اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل　　ہاں اپنے ہم سنوں میں تمہارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

ان ننھے ہاتھوں سے اُٹھے گا یہ علم　　چھوٹے قدوں میں سب سے تنوں میں سب سے کم
نکلے تنوں سے سبطِ نبیؐ کے قدم پہ دم　　عہدہ یہی ہے بس یہی منصب یہی حشم
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخرِ روزگار　　زیبا نہیں ہے وصفِ اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار　　دکھلاؤ آج جعفر و حیدر کی کارزار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علیؑ کے ہیں

اسے اعجاز کہیے یا الہام یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو شہزادی عالم کے ذہنِ اقدس سے نکلے حد یہ کہ ذہن میں یہ تک نہیں گزرتا کہ انہوں نے جو کچھ فرمایا ہوگا، عربی میں فرمایا ہوگا۔

ذرا مرثیے کے اجزا پر ہی نظر ڈالیے کہ کس قدر مختلف مواقع کے حامل ہیں پھر ان کی روشنی میں اس معجز بیان کا اعجاز دیکھئے جیسے ہیں جس منظر یا جذبے کو بیان کر دیا نظروں کے سامنے آ گیا۔ جس کا سراپا لکھ دیا گویا تصویر کھینچ دی۔ رخصت پر آئے تو قلوب کو بے تاب کر دیا۔ رجز لکھ رہے ہیں انیسؔ لیکن بالکل یہ معلوم ہو رہا ہے کہ خود نبرد آزما رجز پڑھ رہا ہے انصار کا رجز ان کے منصب و جاہ کے مطابق بنی ہاشم کا رجز ان کے مرتبے کی شان لئے ہوئے ماہ بنی ہاشم کا رجز بالکل ان کے شایانِ شان اور شہنشاہ کربلا کا رجز شاہی تیور لئے ہوئے جو شہنشاہِ دین و دنیا کے ہونے چاہئیں۔ جنگ کا بیان پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے خود رزمگاہ میں ہو رہیں۔ خود انیس فن سپہ گری کے ماہر اس پر زبان و بیان پہ مکمل قدرت کس میں دم ہے

کہ ان کے مدِ مقابل آئے۔ شہادت اور بین لکھے تو قیامت بپا کر دی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کلیجہ کو مسل رہا ہے قلب کو برما رہا ہے۔
خدائے سخن نے نظم و نثر کا فرق تو اپنی قدرت کاملہ سے مٹا ہی دیا لیکن قیامت پہ قیامت یہ ہے کہ ایک ہی حال میں کئی کئی مرثیے لکھے ہیں۔ روزِ عاشور مختصر ترین سپاہ حسینی کے گنے چنے شہید، وہی دوپہر کے گزرے ہوئے واقعات وہی مواقع لیکن کیا مجال ہے کہ کہیں خیالات و الفاظ کی تکرار ہو۔ کمالِ بے مثال پر حرف نہ آجاتا۔ محال کو ممکن کر دکھانا اسی خدائے سخن کا کام تھا۔ انیس نا ... حضرت اسے تعلّی کہیں گے لیکن ان کے وہ دعوے ہیں جن کے لاتعداد دلائل انیس کے ہاں موجود ہیں۔ کون ذی فہم اسے تعلّی کہہ سکتا ہے فرماتے ہیں۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک رنگ کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

لاریب فیہ انیس نے جو کچھ فرمایا وہ کر دکھایا انہوں نے واقعی ایک ہی مضمون کو سو سو رنگ سے یوں لکھا کہ آج تک لوگ دنگ ہیں، ہر رنگ اپنی مثال آپ ہے۔
منتخب اور ممتاز مرثیہ نگاروں کے مراثی پر نظر ڈالیئے۔ بعض تو پورے کے پورے مرثیے بہت کمزور نظر آئیں گے بعض میں کہیں رزم سست، کہیں مصائب کے بند معمولی۔ انیس نے کم و بیش ڈھائی لاکھ اشعار کہے (یہ تعداد صرف مطبوعہ کی ہے۔ غیر مطبوعہ اس کے علاوہ ہیں) اس پرگوئی پر بھی یہ شرف صرف انیس کو ہی حاصل ہے کہ کوئی مرثیہ لیجئے۔ اگر کسی مجلس میں پڑھنے کے لئے صاد لگانا چاہیں تو انتخاب دشوار ہو جائے گا۔ سمجھ میں ہی نہ آئے گا کہ کس بند کو لیجئے اور کسے چھوڑ دیجئے۔ کیوں کہ عالم یہ ہوگا کہ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اس کمالِ بے مثال کی توجیہہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

خلاق عالم نے اپنے اس شاہکار میں نہ صرف مرثیہ گوئی کی جملہ صفات حدِ کمال تک ودیعت فرما دیں بلکہ مرثیہ خوانی کی معراج بھی عطا فرما دی۔ انیس کو جن ممتاز ہستیوں نے مرثیہ پڑھتے دیکھا ان میں سے چند نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ منبر پر یوں جلوہ افروز ہوتے جیسے کہ شاہ جا کا اپنے تخت پر، ہو وہ صرف اپنی ہاتھ کی دو انگلیوں اور چشم و ابرو سے کام لیتے۔ خدا جانے ان میں کیا سحر تھا کہ ہر منظر اور ہر مقام مجسم ہو کے سامنے آتا ہوا محسوس ہوتا۔ سامعین کی محویت کا یہ عالم ہوتا کہ پہلو بدلنے تک کا ہوش نہ ہوتا۔ گھڑیاں رکھی کی رکھی رہ جاتیں نگاہیں لڑی ہوئی ہیں۔ پلک جھپکنا بار گزرتا ہے۔ انیس نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو اس نقطۂ عروج تک پہنچا دیا کہ اس سے بلند منزل کا تصور بھی ممکن نہیں۔

انور سدید

میر انیس کا موت اور قبر سے پیار

میر انیس کی شاعری میں فقر، استغنا اور قناعت کا رجحان ان کی شخصیت کے ایک منفرد زاویے کے طور پر ابھرتا ہے۔ اور یہ حقیقت بڑی عجیب نظر آتی ہے کہ ایسے دور میں جب پورا لکھنؤ جسم کی آرائش اور حصولِ لذت کے لئے لہو و لعب میں گرفتار تھا میر انیس نے طلبِ جاہ، طلبِ دولت اور طلبِ شہرت کے خلاف مسلسل آواز بلند کی اور مادی دنیا اور آخرت میں ایک واضح خطِ امتیاز کھینچا۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ

جو شے ہے فنا اسے بقا سمجھا ہے
جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ فنا میں عمر مانندِ حباب
غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے ؟

گویا میر انیس کی نظر میں حیات کا یہ مانند حباب مختصر سا سفر در اصل بحرِ فنا کا سفر ہے۔ اور انسان اپنی موہوم حیثیت کو بھلا کر "کم" کو "سوا" سمجھنے کی غلطی کر رہا ہے۔ بادی النظر میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر انیس زندگی کی ناپائیداری حقیقت سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ کبیر و صغیر، امیر و غریب، توانا و ناتواں غرضیکہ ہر انسان کو ایک معینہ گھڑی پر زندگی کو خیرباد کہنا ہے اور بالآخر اس مشتِ خاک کو ایک روز اسی خاک میں مل جانا ہے جس سے اس کی تعمیر اٹھائی گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میر انیس جسم کی آرائش کو ایک کارِ زیاں تصور کرتے ہیں۔ ایمان کی فضیلت اور تقویٰ کی عظمت کو ہر مقام پر نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوس پرستی کے خلاف نفرت کا جذبہ پوری شدت سے پیدا کرتے ہیں اور غفلت شعاروں کو توشۂ آخرت مہیا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اتنا بھی جسم کیا انجام کو سوچ انیس
خاک ہونے کو یہ مشتِ استخواں پیدا ہوئے

ناداں نہ ہو رخصتِ نو پہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے
مانند حباب ہستیِ انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد
سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

گر لاکھ برس جیئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

کیوں زر کی ہوس میں در بدر پھرتا ہے
جانا ہے تجھے کہاں، کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے

میر انیسؔ کی اخلاقیات میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ انہوں نے فرد پر ہستیِ ناپائیدار کی بے حیثیتی ثابت کرنے کی ہمیشہ سعی کی ہے اور اس اظہار میں انہوں نے جراحت پیدا کرنے کی بجائے انکسار پیدا کیا ہے اور فرد کو اپنے اعتماد میں لے کر اسے ایک ازلی و ابدی حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ رباعی ملاحظہ ہو جس میں نصیحت کا معروضی لہجہ نمایاں ہے۔

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے — ناداں تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لیے ضرور اک دن ہے فنا — آنا تیرا دلیل جانے کی ہے

تاہم ایک بات واضح ہے کہ میر انیسؔ نے موت کے فلسفے کو سلجھانے، موت کی ماہیت بیان کرنے یا اس میں کوئی نیا پہلو دریافت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے موت کو زندگی کے مخالف رخ کے طور پر یوں قبول کیا ہے کہ "ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا"۔ چنانچہ ان کے ہاں موت کا تصور زندگی کو آسودگی اور خوش حالی سے پوری طرح ہمکنار نہیں ہونے دیتا۔

انساں ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں — پیچ ہے کوئی آسودہ و خوشحال نہیں
اندیشۂ آشیاں و خوفِ صیاد — مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

اس رباعی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر انیسؔ دنیا سے بیزاری کے مبلغ ہیں اور شاید تیاگ کے فلسفے کو فروغ دینا پسند کرتے ہیں۔ بظاہر یہ بات درست نظر آتی ہے کہ خواجہ میر دردؔ اور مظہر جانجاناں کی دلی سے آبائی تعلق کی بناء پر ان کے ہاں بھی تصوف کے رائج الوقت رجحانات کی موجودگی کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا اور بعض اشعار میں تصوف کے اثرات اتنے واضح نظر آتے ہیں کہ انہیں صرف" برائے شعر گفتن خوب است" کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں جس میں ذاتِ واحد کی بیکراں اور لازوال نمود کے نقوش نمایاں نظر آتے ہیں۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

انہوں نے انسان کو بیشتر حباب سے تعبیر کیا ہے جو پانی سے تشکیل پاتا ہے اور ایک وقفۂ مختصر کے بعد پانی میں ہی ضم ہو جاتا ہے۔

ع مانندِ حباب ہستیٔ انساں ہے۔ ع ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب

دوسری طرف وہ اس حقیقتِ اولیٰ کے بھی عاشق ہیں۔ جسے انہوں نے دیکھا نہیں لیکن جس سے وصال کی خواہش ان کی ایک ازلی و ابدی خواہش ہے۔

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں — جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانا ہوں

دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیسؔ جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

اور اس حقیقتِ اولیٰ کو پانے کے لئے ان کا ہر قدم لغزشِ مستانہ بن جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو کھونے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ایک ایک قدم لغزشِ مستانہ ہے گلزارِ بہشت اپنا مے خانہ ہے
سرمست ہیں حبِ ساقیِ کوثر سے آنکھیں شیشہ ہیں قلب پیمانہ ہے
جب تک میں تھا تو بعد تھا برسوں کا • جب آپ کو کھو دیا تو پایا ہے تجھے

مادّی زندگی کی تکذیب کی ایک اور وجہ وہ ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے جو میر انیسؔ نے لکھنؤ کے لہو و لعب کے خلاف پیدا کرنا چاہا اور جو حضرت امام حسینؑ کی حیاتِ طیبہ اور واقعۂ کربلا کی نادر ترین عطا ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا زیادتی ہوگی کہ میر انیس نے اس زندگی کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا۔ میر انیسؔ جب دنیا کو ایک نور قرار دیتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسے ایک اٹل اکائی کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے کھانے کی لذت اور پانی کے مزے سے بھی آگہی کا بھرپور اظہار کیا ہے اور یہ لذائذِ دنیا میں ہی شمار ہوتے ہیں۔

کیا حال کہیں دل کی پریشانی کا کھانے کی ہے لذت نہ مزا پانی کا
مر رہیئے کسی دشت کے دامن میں انیسؔ پردہ ہے یہی جامۂ عریانی کا

اہم بات یہ ہے کہ میر انیسؔ نے زندگی کو اس حرارت سے تعبیر کیا ہے جو انسان کو ہمیشہ متحرک رکھتی ہے چنانچہ ان کا ایقان ہے کہ موت زندگانی کے ظاہری جھگڑوں کا خاتمہ ہے لیکن اگر حیات برقرار رہے تو موجِ حوادث کے تھپیڑے انسان پر وارد ہوتے ہی رہتے ہیں اور وہ ان سے کنارہ کشی یا نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

وہ موجِ حوادث کا تھپیڑا نہ رہا کشتی وہ ہوئی غرق، وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیسؔ جب ہم نہ رہے کوئی بکھیڑا نہ رہا

اور یہی وجہ ہے کہ ان میں ایسے عشق کے باوجود ان کے ہاں اس دنیا کو چھوڑنے پر غم اور دکھ کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔

جس دن کہ فراق روح و تن میں ہوگا مشکل اٹھنا اس انجمن میں ہوگا
دل سے دنیا کے ولولے جاتے ہیں • اک آن میں طوبیٰ کے تلے جاتے ہیں
ہاتھ سے جاتا رہا نقدِ حیات • جان دے کر آئے بے جاں ہو گئے

چنانچہ وہ عامۃ الناس کو بار بار جھنجھوڑتے ہیں اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہیں کہ صیادِ اجل کمیں گاہ میں ہے اور متاعِ حیات لوٹنے کی تاک میں لگا ہوا ہے۔

ہشیار کہ وقت سازِ برگ آیا ہے ہنگام تیغ و برف و تگرگ آیا ہے
ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے ° جاگو جاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
اٹھو اٹھو یہ خوابِ غفلت کب تک دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

میں عرض کر چکا ہوں کہ میر انیس نے مادی دنیا اور آخرت میں ایک واضح حدِ امتیاز قائم کی ہے اور وہ موت کو زندگانی کے ظاہری جھگڑوں کا انجام تصور کرتے ہیں۔ لیکن واضح کرنا ضروری ہے کہ میر انیس موت کو زندگی کا انجام تصور نہیں کرتے۔ بلکہ وہ حیات بعد از ممات کے قائل نظر آتے ہیں اور اس دنیا کی عیش و عشرت و ہنگامی کامرانیوں سے سرشار ہو کر نخوت میں ڈوب جانے والوں کو اس زندگی کی تیاری کا درس دیتے ہیں جو غیر فانی اور دائمی ہے

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے؟ جانا ہے تجھے کہاں، کدھر پھرتا ہے؟
جس شخص کو عقبیٰ کی طلب گاری ہے ° دنیا سے ہمیشہ اسے بیزاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دو نور غافل یہ خواب ہے، وہ بیداری ہے

اور یہی وجہ ہے کہ میر انیس موت سے خوف نہیں کھاتے بلکہ مادی زندگی کے اس انجام کے لئے ہمہ تن تیار نظر آتے ہیں اس کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوتے اور عدم کو راحت آباد شمار کرتے ہیں۔

یہ الفتیں ہی ہیں دنیا میں یادگارِ مرگ میر انیس تجھے اور نیز خیال ہے جیسے
ہے راہِ بہشت کتنی ہموار ° بند آنکھیں کئے لوگ چلے جاتے ہیں
راحت آبادِ عدم ہے خوب جا ° پھر نہ آئے جہاں سے جو گئے
یا رب کہیں وہ جلد زمانہ ہووے ° بندہ سوئے کربلا روانہ ہووے
لیکن یہ دعا ہے مجیب الدعوات جانا ہووے تو پھر نہ آنا ہووے

موت سے اس قدر والہانہ پیار نے ہی میر انیس کے ہاں قبر دوستی کے رجحان کو فروغ دیا ہے اور ان کے ہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں اس رجحان کے نمایاں اور متنوع زاویے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مادی دنیا کا ایک نقشہ جس کے خلاف میر انیس نے بالواسطہ ردِ عمل کا اظہار کیا ہے شور و شغب ہے۔ چنانچہ انہوں نے جہاں موت کی بار بار تمنا کی ہے وہاں قبر کے سکوت کا تذکرہ بھی پوری تکرار سے کیا ہے اور اس گوشۂ عافیت کا حصول میر انیس کی بہترین خواہشات میں سے نظر آتا ہے۔

خاموشی میں یاں لذتِ گویائی ہے آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نے دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا خیال مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

میر انیس کا قبر سے پیار درحقیقت اپنے اندر غوطہ لگانے اور انجمن خیال آراستہ کرنے کا عمل ہے۔ احسن لکھنوی کا بیان ہے:

کہ میر انیس جب شعر کہتے تو ایک چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ لیتے۔ منہ ڈھانپ لیتے۔ ایک بازو خم کرکے اس کی کلائی آنکھوں پر رکھ لیتے۔ وجدان کا عالم طاری ہو جاتا اور اشعار کی بارش آبدار موتیوں کی طرح گرنے لگتی۔ شعر کہنے کے لئے میر انیس کا یہ اہتمام ان کی قبر دوستی کے رجحان کا ہی ایک روشن زاویہ ہے اور یہ اس لئے معنی خیز ہے کہ ہر بڑے فن کار کے ہاں جب سراغ زندگی پانے کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے تو وہ بطنِ ماہی، سایۂ شجر یا چاہِ یوسف تلاش کرتا ہے۔ میر انیس کے ہاں قبر وہ گوشۂ عرفان ہے جہاں فطرت اپنے تمام راز عریاں کر ڈالتی ہے اور فن کار کو معجزۂ فن سے سرفراز کر دیتی ہے۔ قبر سے میر انیس کے غیر معمولی لگاؤ کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ بوالہوس دوست اس حد سے آگے ساتھ دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ گویا قبر ایک ایسا مقام ہے جہاں دوست بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور منہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔

پھر دوست جب ہوگئی قبر بند ‌ ‌ ‌ کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں
احباب لحد تلک تو پہنچائیں گے ‌ ‌ ‌ کوئی نہ رہے گا سب چلے جائیں گے

جامعہ ایمانیہ ۱۵۴-الف بلاک ۲ پی، ای، سی، ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

جامعہ ایمانیہ اردو زبان کے ذریعہ شیعہ علوم دینیات کے فروغ کا مرکزی ادارہ ہے۔ سردست اس کے زیر اہتمام دو امتحان یعنی (۱) واقف دینیات (۲) عالم دینیات منعقد ہوتے ہیں۔ ان امتحانوں کا نصاب کلیتہً اردو زبان میں ہے۔ امتحان تحریری سوالیہ پرچوں کے ذریعہ ہوتا ہے اور ہر امتحان میں بلا تخصیص عمر انفرادی یعنی پرائیویٹ طور پر شرکت کی اجازت ہے۔ گویا امتحان کی تیاری اپنے اپنے مقام پر اپنی سہولت کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ نصاب تعلیم کا تعین، سوالیہ پرچوں کی تیاری اور جوابی کاپیوں کی جانچ ملک کے ممتاز علماء دین و ادب کرتے ہیں۔ امتحان کے مرکز امیدواروں کی سہولت کے لحاظ سے مختلف مقامات پر مقرر کئے جاتے ہیں۔ جامعہ ایمانیہ کے ہر امتحان کے نصاب میں عقائد، مسائل فقہ، اخلاق، تاریخ، سیرت، معصومین اور مذہبی ادبیات (یعنی قصائد، مراثی، نوحہ جات وغیرہ) اور دیگر عنوانات کا نہایت موزوں امتزاج رکھا جاتا ہے۔ جامعہ ایمانیہ نہ تجارتی ادارہ ہے نہ کسی قسم کا چندہ طلب کرتا ہے۔ ہمارا اور آپ کا دینی فریضہ ہے کہ خود بھی علم دین حاصل کریں اور اپنے بچوں کو بھی ضروری دینی معلومات سے بیگانہ نہ چھوڑیں۔ اس مقصد کے لئے جامعہ ایمانیہ کے امتحانوں میں شرکت نہایت موزوں طریقہ ہے۔ اگر بحمداللہ آپ دینی معلومات سے بہرہ ور ہیں تو امتحان میں شرکت اور کامیابی سے آپ کا علم مستند ہو جائے گا۔ اگر معلومات میں کچھ کمی ہے تو وہ پوری ہو جائے گی۔ مفصل لائحہ عمل وغیرہ ایک روپیہ پچاس پیسے کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرمائیے۔

خادم سید علی رضا مہتمم جامعہ ایمانیہ

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

میرانیس کی وضعداری اور دوست نوازی ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔ چنانچہ وہ دلوں کے نازک آبگینوں کو ہر قیمت پہ تحفظ مہیا کرتے تھے۔ خود مجلس آرا تھے اور احباب کی مجالس کو پسند کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ مقام رحلت پر دوستوں کی بے رخی پر میرانیس کے ہاں ردعمل کے طور پر شکوے کا لہجہ پیدا ہوا ہے۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ ردعمل دوستوں کی بے رخی اور قبر کی تنہائی کے خلاف ہے۔ قبر کے خلاف نہیں۔ قبر تو بیگانہ سہاروں پہ اعتماد کے برعکس خود اعتمادی کو بڑھاتی ہے اور اس سے میرانیس کو اتنا والہانہ پیار ہے کہ وہ اس سے لپٹ کر سونے کے لئے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ قبر درحقیقت میرانیس کی محبوب ہے۔ اور یہ حقیقت ان کی مندرجہ ذیل رباعی میں پوری طرح نمایاں ہے۔

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے سوؤں تجھ سے اے قبر میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

گویا قبر وہ شیریں ہے جسے حاصل کرنے کے لئے میرانیس زندگی کا بے ستون کاٹ کر لاتے ہیں۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ مس کرنے اور لپٹنے کی اس خواہش کے باوجود قبر سے میرانیس کا پیار کسی ارزاں جذبے کی پیداوار نہیں۔ میرانیس کی نجی زندگی سادہ اور ہموار تھی۔ جس میں لکھنوی معاشرے کی بے راہ روی کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ حضرت امام حسین کی حیات طیبہ اور واقعات کربلا کی مسلسل نظم نگاری نے انہیں مزاج کی طہارت اور کردار کی پختگی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ ان کے تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ وہ اخلاقیات کے ایک بلند معیار سے کبھی نیچے نہیں گرے۔ اس لئے ان کے ہاں جسمانی پیار کے کسی سفلی درجے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ لذت کوشی کے برعکس ان کے پیار میں والہانہ عقیدت اور بے پناہ تقدس ہے اور ان کی جذباتی وارفتگی کے گرد بھی عقیدت اور انکسار کا پُرنور دائرہ نظر آتا ہے۔ میر محمد رضا رضی نے تاریخ تاج الخواتین[1] میں لکھا ہے کہ "میرانیس کی والدہ نماز روزہ کی پابند اور انتہا سے زیادہ پرہیزگار تھیں۔ وہ ہر بات کو مذہب اثناعشریہ کے موافق کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی وضع، ان کا لباس، ان کی رفتار و گفتار دوسری بیبیوں کے لئے شریفانہ وضع کا مستند نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ بڑی بڑی امیرزادیاں ان سے ملنے کی خواہشمند رہتی تھیں لیکن مجال کیا جو بغیر کسی تقریب و طلب کے گھر سے باہر جائیں۔ وہ خود کو ہر باب میں پابندِ آداب رکھنا پسند کرتی تھیں اور ان کو اخلاقِ رذیلہ اور سوءِ ادبی سے سخت نفرت تھی۔"

میرانیس کی تربیت اور کردار سازی میں ان کی والدہ معظمہ کے ان اوصاف کا بڑا اہم دخل نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ باور کرنا مناسب ہے کہ قبر کا پیار دراصل ماں کے پیار سے مماثل ہے اور اس میں جو سکون میرانیس کو میسر آیا ہے وہ دراصل آغوشِ مادر کا سکون ہے۔ ثبوت کے لئے میں نے میرانیس کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل شعر سے میرے خیال کی تائید خود ہی کر دی۔

یاد آیا دامنِ مادر کا چین پاؤں پھیلا کر لحد میں سو گئے

مزید دیکھئے کہ "دامانِ شب میں لشکرِ انجم نہاں ہوا" میں بھی رات اس عظیم ماں کے مترادف ہے۔ جس کی آغوش میں ستارے

(باقی ص ۵۹ پر)

---

[1] بحوالہ ماہِ نو میرانیس نمبر مقالہ "میرانیس کے حالات زندگی" از ضمیر اختر نقوی

انتظار حسین

انیسؔ کے مرثیے میں شہر

میر انیس کے مناظرِ قدرت کے بیان کے متعلق، مولانا شبلی کے وقت سے لے کر اب تک، ہم بہت کچھ کہہ سن چکے ہیں۔ سفر کے بیان کے واسطے سے، اور میدانِ کربلا میں قیام اور شہادت کے واسطے سے، انیس نے صحرا کا ایک بھرپور بیان پیش کیا ہے۔ صحرا اپنی صبح و شام کے ساتھ، اور اپنی دوپہروں اور راتوں کے ساتھ، یہاں جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ مگر انیس نے کچھ بستیوں کے نقشے بھی پیش کئے ہیں اور وہ بھی اتنے ہی مؤثر اور بامعنی ہیں جتنے صحرا کے نقشے مؤثر و بامعنی ہیں۔

انیس کے یہاں دو شہر بہت جیتی جاگتی صورت میں نظر آتے ہیں۔ وقتِ سفر کا مدینہ، اور ابن زیاد کے وقت کا کوفہ۔ حضرت امام حسینؑ کے مدینہ سے رخصت کے احوال میں، صرف رخصت کا احوال بیان نہیں ہوا ہے۔ اس بیان میں ایک بھرا پُرا شہر ہماری آنکھوں کے سامنے اُبھرتا ہے۔ ایسا شہر جو ایک تہذیبی مرکز تھا اور اب ایک گھرانے کے یہاں سے نکلنے کی وجہ سے اس کی ساری معاشرتی اور تہذیبی زندگی ایک بحران سے دوچار ہے۔

بقیہ صفحہ ۵۳ مسلسل پناہ لیتے ہیں اور اگلی صبح ورقِ خاک کو زرافشاں کر دیتے ہیں[1]۔ یہ پہلو مثبت نوعیت کا ہے اور ایک الگ تخلیقی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی قبر میں کھو جانا درحقیقت ایک نئی زندگی کی بشارت ہے۔ یوں بھی ہندوستانی اساطیر میں زمین کو ماں کی علامت قرار دیا گیا ہے[2]۔ زمین تخلیق کے لئے بیج کو اپنے دامن میں پناہ دیتی ہے اور ایک معین عرصے تک آغوشِ راحت میں رکھنے کے بعد اسے حیاتِ نو سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اس زاویئے سے دیکھئے تو میر انیس کی قبر پسندی تخلیق کے مسلسل اور لازوال دائروی عمل کا ایک بے حد اہم زاویہ ہے۔

---

[1] "ذرّوں سے زرافشاں ورقِ خاک ہوا تھا" میر انیسؔ
زمین کی تخلیقی اہمیت کا یہ زاویہ غالب اور آتش کے ہاں بھی ابھرا ہے۔
"خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں" غالب
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا — آتشؔ

[2] رات کے بطن سے ہر صبح طلوع ہوتی ہے یہ میر انیسؔ کے ہاں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر وزیر آغا کا گراں قدر مقالہ "میر انیس اور صبح کا تصور" ملاحظہ کیجئے۔ "ماہِ نو میر انیس نمبر"

در پر کوئی روتا ہے کوئی راہ گزر میں   تاریک ہے دنیا کسی غمگیں کی نظر میں
ہیں جمع محلے کی جو سب عورتیں گھر میں   اک حشر ہے ناموسِ شہِ جن و بشر میں
سب مل کے بکا کرتے ہیں جب آتا ہے کوئی
یوں روتے ہیں جس طرح کہ مر جاتا ہے کوئی

یہ محلہ کی عورتوں کا احوال ہے۔ مردوں کا احوال یہ ہے ؎

خلقت کا ہے مجمع درِ دولت پہ سحر سے   جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے وہ گھر سے
سب کہتے ہیں برسا کے لہو دیدۂ تر سے   چھپ جائے گا اب فاطمہؑ کا چاند نظر سے
اندھیر ہے گر یہ شہِ والا نہ رہے گا
اب شہر کی گلیوں میں اُجالا نہ رہے گا

عون و محمد، ہمجولیوں، حضرت علی اکبر کے ساتھ کے کھیلے ہوئے لڑکوں اور حضرت عباسؑ کے ساتھ کے جوانوں کا حال پڑھتے پڑھتے پورے شہر کا نقشہ اس طرح ابھرتا ہے۔ ؎

برپا ہے مدینہ میں تلاطم کئی دن سے   ہے راحت و آرام و طرب گم کئی دن سے
ہر گھر میں ہے اک شور و تظلم کئی دن سے   منہ ڈھانپے ہوئے روتے ہیں مردم کئی دن سے
وہ غم ہے کہ آرام کا جویا نہیں کوئی
راتیں کئی گزری ہیں کہ سویا نہیں کوئی

یثرب کے زن و مرد ہیں سب بے خور و بے خواب   شبیرؑ کی فرقت کی کسی دل کو نہیں تاب
ہمسائے ہیں اک غل ہے بکا کرتے ہیں احباب   غل ہے کہ مدینے میں خوشی اب ہوئی نایاب
اس شاہ میں خو بو ہے شہِ عقدہ کشا کی
اب کون خبر راتوں کو لے گا فقرا کی

یہ نقشہ ایک پریشان شہر کا نقشہ ہے جو اپنی جی جاتی مجلسی زندگی کے ساتھ بسر کرتے کرتے یکایک ایک بڑے بحران سے دوچار ہو گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ ؎

اب شہر کی گلیوں میں اُجالا نہ رہے گا

انیس کے یہاں مختلف مقامات پر ہم اپنی آنکھ سے مدینہ کی خلقت کے درمیان سے امام حسینؑ کو رخصت ہوتے اور امام حسینؑ کی رخصت کے ساتھ گلیوں سے اُجالے کو رخصت ہوتے اور مدینہ کو ویران ہوتے دیکھتے ہیں۔ کوفے کا نقشہ اور ہے یہ ایک دہشت زدہ شہر کا نقشہ ہے۔ جیسے یکایک شہر میں مارشل لاء لگ گیا ہو۔ یہ نقشہ ایک راوی کے واسطے سے پیش ہوا ہے۔

دورانِ سفر امام حسینؑ کوفے کی طرف سے آنے والے ایک مسافر سے پوچھتے ہیں کہ ؎

کوفے کی خبر سے بھی کچھ آگاہ ہے بھائی؟

اس سوال کے جواب میں ؎

وہ کہتا تھا کوفے میں عجب غدر ہے مولا — ہر سمت میں فتنے ہیں فساد اٹھتے ہیں ہر جا
دوراں کا ہے کچھ جن کو مروت نہیں اصلا — ہوتے ہیں ستم کوئی کسی کی نہیں سنتا
ٹوٹا ہے فلک ظلم کا شیعوں کے سروں پر
جب دیکھئے دوڑیں چلی آتی ہیں گھروں پر

اشراف ہیں جتنے وہ نکلتے نہیں گھر سے — دروازے نہیں کھولتے لٹ جانے کے ڈر سے
ہو جاتی ہے جب شام تردد ہے سحر سے — سب کرتے ہیں سجدے کہ بلا ٹل گئی سر سے
یہ ظلم یہ بیداد نہیں اور کسی پر
واللہ یہ تباہی ہے محبانِ علی پر

مدینے کا نقشہ یہ تھا کہ اسے اپنے گلی کوچے ویران ہوتے نظر آ رہے تھے۔ کوفے کا بحران مدینے کے بحران سے مختلف ہے۔ اس شہر کو یکایک دہشت نے آلیا ہے۔ گلی کوچوں کا احوال یہ ہے ۔

آفت ہے محلوں میں بپا بند ہیں بازار

کوچے بھی اجڑ جانے سے بے ربط ہوئے ہیں — جو بھاگ گئے تھے ان سب کے مکاں ضبط ہوئے ہیں

لوگوں کا احوال یہ ہے ؎

کچھ خوف سے مخفی ہیں گرفتار ہیں کچھ لوگ — بگڑے ہوئے آمادۂ پیکار ہیں کچھ لوگ
کوفے سے نکل جانے پہ تیار ہیں کچھ لوگ — کچھ قتل ہوئے ہیں، بہ سرِ دار ہیں کچھ لوگ

اور کوفے سے آنے والا مسافر بڑے دکھ کے ساتھ امام حسینؑ کو بتاتا ہے ؎

آشوب ہے اس شہر میں اے خلق کے سرتاج — جو دیں کے ستوں تھے وہ مکاں ہو گئے تاراج
کیا کیا شرفانِ شیعہ کر ہیں محتاج — کل قتل ہوا وہ جو گرفتار ہوا آج

اس بیان سے کوفے کی تصویر یہ مرتب ہوتی ہے کہ شہر کی پوری زندگی معطل ہے۔ نہ مجلسیں نہ محفلیں، نہ لین دین نہ خرید و فروخت بازار بند پڑے ہیں گھر کے گھر خالی ہو گئے ہیں ؎

ویراں ہیں جو سو گھر تو کہیں ایک ہے آباد

جو گھر آباد ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ دروازے بند ہیں۔ مکیں اندر چھپے بیٹھے ہیں۔ شہر سائیں سائیں کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ تحریکِ مزاحمت بھی جاری ہے ؎

بگڑے ہوئے آمادۂ پیکار ہیں کچھ لوگ　　کچھ قتل ہوئے ہیں بہ سرِ دار ہیں کچھ لوگ

پورا شہر ایک جبر کی گرفت میں ہے۔ تحریکِ مزاحمت میں شریک لوگوں کے خلاف کارروائی جاری ہے ہی مگر عام شہری بھی جبر سے بچے ہوئے نہیں ہیں ؎

پھرتے ہیں مکانوں کے مکیں مضطر و ناشاد　　حاکم ہے وہ مغرور کہ سنتا نہیں فریاد

اس افراتفری میں غنڈوں کی بن آئی ہے۔ شرفا اور وضعدار لوگ سخت مشکل میں ہیں۔ شرفا، نانِ شبینہ کو محتاج ہیں جنہیں اپنی عزت کا پاس ہے۔ وہ گھر سے قدم نہیں نکالتے۔ موقع پرستوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں ؎

وہ خوش ہیں رعیت میں جو حاکم سے ملے تھے　　پرسش ہے کہ کیا سوچ کے مسلم سے ملے تھے

مرثیوں میں بالعموم ہماری ساری توجہ میدانِ کربلا پر رہتی ہے۔ مگر انیس نے یہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ میدانِ کربلا سے دور بستیوں پر کیا گزر رہی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ میدانِ کربلا میں ایک واقعہ گزر گیا اور لوگ اپنی اپنی بستیوں میں آرام سے بیٹھے رہے۔ انیس کے مرثیوں میں ہم میدانِ کربلا ہی کو نہیں دیکھتے، بلکہ پوری اسلامی مملکت کو ایک بحران سے دوچار دیکھتے ہیں۔ یہ ایسا بحران ہے جس میں بستیوں کا سکون تباہ ہو چکا ہے۔ معاشرتی زندگی تتر بتر ہو گئی ہے۔ جبر کا دور دورہ ہے اور انسانی روح ایک کرب کے عالم میں ہے۔ اس پس منظر میں کربلا کے میدان میں گزرنے والی واردات زیادہ ہمہ گیر اور با معنی نظر آتی ہے۔

مگر کیا کوفے کا بیان صرف کوفے کا بیان ہے؟ بات یہ ہے کہ انیس ان بڑے شاعروں میں سے ہیں جو کسی بھی زمین و زماں کی بات کر رہے ہوں مگر اپنے زمین و زمان سے ان کا رشتہ بہر حال پیوست رہتا ہے۔ انیس کے مرثیوں کو لکھنؤ کی تہذیبی اور سیاسی صورتِ حال سے منقطع کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان مرثیوں میں لکھنؤ کی تہذیب کی تصویریں تو نقادوں کو بالعموم نظر آئی ہیں۔ لیکن اس پر توجہ نہیں دی گئی ہے کہ ایک مخصوص عہد کی سیاسی صورتِ حال بھی ان مرثیوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ انیس اس دور میں سانس لے رہے تھے، جب پورے ہندوستان کے ساتھ لکھنؤ بھی ایک سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کا ایک بہت بڑا مورچہ لکھنؤ بھی تھا اور دلی کے محاذ پر تو ہتھیار جلد ڈال دیئے گئے مگر لکھنؤ کا مورچہ لمبا کھنچا۔ کہیں ۱۸۵۸ء میں جا کر یہاں مجاہدوں کو پسپائی ہوئی اور اس طرح کہ آخر وقت تک مجاہد یہاں لڑتے رہے۔ مجاہدوں کی قائد نواب حضرت محل نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ وہ لکھنؤ سے نکلیں اور نیپال کی طرف گئیں۔ انیس کے یہاں کوفے کا نقشہ ملتا ہے وہ نقشہ کوفے کے ساتھ ساتھ نواب حضرت محل کے بعد کے لکھنؤ کا بھی ہے ؎

کوچے بھی اجڑ جانے سے بے ربط ہوئے ہیں
جو بھاگ گئے تھے ان سبھی کے مکاں ضبط ہوئے ہیں

جب دیکھئے دوڑیں چلی آتی ہیں گھروں پر

کچھ تو ہیں مخفی ہیں گرفتار ہیں کچھ لوگ　　　بگڑے ہوئے آمادہ پیکار ہیں کچھ لوگ

آفت ہے محلوں میں بپا بند ہیں بازار

کیا کیا شرفا نانِ شبینہ کو ہیں محتاج　　　کل قتل ہوا وہ جو گرفتار ہوا آج

اشراف ہیں جتنے وہ نکلتے نہیں گھر سے

دروازے نہیں کھولتے لٹ جانے کے ڈر سے

کیا یہ اشعار فرنگیوں کے قبضہ میں آئے ہوئے لکھنؤ کا نقشہ پیش کرتے نظر نہیں آتے؟

کربلا تو انسانی روح کی جدوجہد کا ایک جاوداں استعارہ ہے جس عہد میں بھی ظلم کی صورت حال پیدا ہوتی ہے اور انسانی روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ اس کا مؤثر اور بامعنی اظہار اسی استعارے کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے اور لکھنؤ کے محاذ پر جو لوگ انگریز کے خلاف صف آرا تھے ان کے تحت الشعور میں یہ استعارہ رچا بسا تھا۔ مگر یہ کام صرف انیس کو کرنا تھا کہ انہوں نے لکھنؤ کی اس صورت حال میں اس استعارے کی کارفرمائی کو شناخت کیا۔

پروفیسر یوسف جمال انصاری

رُباعیاتِ انیسؔ

فنِ شاعری میں رباعی کی صنف مشکل ترین اصناف میں شمار کی جاتی ہے۔ جس کا اندازہ اردو شعراء کے دواوین کا سرسری سا مطالعہ کرنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ مشہور شعراء میں سے بھی ایک کثیر تعداد ایسی نکل آئے گی۔ جس نے رباعی میں طبع آزمائی نہیں کی۔ ایسے مشاہیر کی بھی کمی نہیں، جنہوں نے رسمی طور پر رباعیات کہی ہیں۔ لیکن وہ اتنی بے مزہ ہیں کہ ان کا عدم و وجود برابر ہے۔ بعض شعراء نے وزن و بحر کے معاملے میں بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ اکثر شعراء نے فنی اعتبار سے درست ہونے کے باوجود ایسی رباعیاں لکھی ہیں، جن کی بنیاد ایک مصرعے پر یا زیادہ سے زیادہ دو مصرعوں پر ہے۔ اور باقی مصرعے محض بھرتی کے ہیں۔ یہ آخری بیان اس لحاظ سے قابلِ غور ہے۔ کہ رباعی فقط چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر مشاہیر شعراء بھی چار مصرعے چست اور مناسب موزوں نہ کر سکیں تو اسے عجزِ شاعرانہ کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اچھی رباعی وہ ہے جس کے چاروں مصرعے باہم مربوط و پیوستہ ہوں۔ اور ان میں ارتقائے خیال موجود ہو۔ یہاں تک کہ چوتھے مصرعے پر قاری کو یہ محسوس ہو کر جو کچھ کہا گیا، بھرپور طریق سے کہا گیا۔ اس میں ایک مزید استادی یہ کہلاتی ہے۔ کہ تیسرا مصرع چونکا دینے والا ہو۔ دیکھنے میں تو غزل رباعی سے وسیع تر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ غزل خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، اس کا ہر شعر اپنی جگہ آزاد ہے۔ اور دوسرے شعر سے کوئی لازمی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن رباعی میں کافی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا خیال بھی چار مصرعوں میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر رباعی استادانہ ہو۔ تو ضرب المثل بننے کے امکانات اس میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ فرق ہے کہ چار مصرعے آخر کار چار مصرعے ہی رہیں گے۔ جتنی بھی بات مثنوی یا قطعے میں ادا کی جا سکتی ہے اتنی رباعی میں ادا نہیں کی جا سکتی۔

رباعی کے فن پر استادانہ گرفت عموماً شاعر کی پختہ عمری کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ بقول انیسؔ سہ

گھٹی عمر، مشقِ سخن بڑھ گئی　　بڑھاپے نے ہم کو جواں کر دیا

اوّل تو فنی لحاظ سے پختہ عمری تک پہنچ کر ہی شاعر زبان و بیان کے اسالیب پر وافی قدرت حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرے صنفِ رباعی کے لئے جس خاص طرزِ خیال کی ضرورت ہے، اور جس طرزِ احساس کو رباعی سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی بڑھاپے ہی میں حاصل ہوتا ہے۔ شورشِ جذبات کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور زندگی کے گوناگوں تجربات سے شاعر گزر چکتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں اس قابل ہوتا ہے کہ کوئی فلسفیانہ پیغام دے سکے۔ رباعی کی شاعری تفکر کی شاعری ہے۔ محض جذبات کی شاعری نہیں۔

چنانچہ جب تک یہ دونوں باتیں حاصل نہ ہوجائیں اچھی رباعی کہنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ رباعی کا تاثر بھی عجیب تاثر ہے۔ غزل کے شعر پر تو ہم آہ یا واہ کہہ لیتے ہیں اور خاموش ہوجاتے ہیں لیکن اچھی رباعی ہمیں یوں متاثر کرتی ہے کہ ہم سوچنے لگتے اس پر سوچتے ہیں اور اس کا پیغام بھلائے نہیں بھول سکتے۔

انیس و دبیر کے دور میں جب مرثیہ گوئی کو بے مثال عروج حاصل ہوا۔ تو رباعی کی مقبولیت بھی بڑھ گئی۔ اس سے پہلے عموماً غزل ہی کے طور پر رباعی کہی جاتی تھی۔ اگرچہ کلیات میر اور دیوان خواجہ میر درد میں بعض معرکۃ الآرا رباعیات بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعداد مختصر ہے۔ مرثیہ گوئی کے زمانہ عروج میں رباعی کہنا ایک روایت بن گیا۔ عموماً مرثیہ پڑھنے سے پہلے شاعر رباعیات پڑھتا تھا چنانچہ رباعی کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہیں دنوں ایک رسم پڑ گئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے منبر پر آتے اور رباعی سناتے اور حاضرین ان کا دل بڑھاتے۔ یہ رسم اب تک جاری ہے۔ مجالس عزا کی رعایت سے جو مضامین رباعی میں باندھے جانے لگے۔ وہ باوقار و سنجیدہ ہوتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ مدح امام عالی مقام و مدح اہل بیت کے مضامین۔ علاوہ ازیں مدحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ الیہ مضامین بھی باندھے جاتے تھے۔ خصوصاً اس لئے کہ مجلس ماتم کی فضا کا تعلق منطقی طور پر ایسے مضامین سے ہوتا ہے۔ فلسفیانہ طرز فکر کی بدولت اور مجالس عزا کی فضا سے ہم آہنگ رہتے ہوئے رباعی کا شاعر مسائل مرگ و حیات پر اظہار خیال کرتا تھا۔ یعنی زندگی بھی کتنی بے ثبات ہے۔ موت کس طرح سر پر منڈلا رہی ہے۔ لیکن غافل انسان محو حرص و ہوس ہے۔ شباب ایک لمحۂ گزراں ہے زندگی کا اعتبار نہیں۔ کہ سانس کا ڈورا کب ٹوٹ جائے۔ اس لئے یاد خدا میں مستغرق رہنا ہی مصلحت ہے۔ صبر و قناعت و رضائے الٰہی پر قائم رہنا ہی مومن کی شان ہے۔ دنیا میں غم بہت ہیں اور خوشی کم۔ بہت سی رباعیات حمد و نعت و منقبت میں ہیں۔ علی الخصوص امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی شان میں ایسی ایسی رباعیات موجود ہیں جن کا جواب نہیں۔

رباعی کو انیس و دبیر کے دور میں وہ فروغ حاصل ہوا جس کا گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انیس کے بعد جب وہ دور مٹ گیا اور برصغیر کی اجتماعی زندگی نے ایک اور ہی کروٹ بدلی۔ تب بھی رباعی کی مقبولیت میں کمی نہ آئی۔ انیس کے بعد غالباً سب سے کامیاب رباعیاں حالی نے کہیں اور پھر بیسویں صدی کے وسط میں جوش، یگانہ، امجد حیدر آبادی، فراق گورکھپوری وغیرہ میدان میں آگئے۔ بعض شعراء نے اپنی رباعیات کا مجموعہ اہتماماً اور منفرد انداز میں شائع کرایا۔ ورنہ پہلے غزلوں کے دیوان میں ضمیمے کے طور پر چند رباعیات ہوا کرتی تھیں اور بس۔

رباعی کہنے کا حق انیس نے ادا کردیا۔ عموماً ہر رباعی بلند پایہ اور قابل تعریف ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک خاصی تعداد ایسی رباعیات کی موجود ہے۔ جن کو صحیح معنی میں لاجواب قرار دیا جاسکتا ہے ؎

مولد جو وہاں حکم قدر سے پایا	کعبہ نے شرف علیؑ کے در سے پایا
گودی میں نبیؐ لئے یہ کہتے نکلے	لو ہم نے وصی خدا کے گھر سے پایا

اوّل تو جو بات اس رباعی میں نظم کی گئی ہے وہ اپنی جگہ بلند و ارفع ہے۔ لیکن جس طرح خیال کو نظم کی لڑیوں میں پرو دیا گیا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اشارہ ایک تاریخی حقیقت کی طرف منظور تھا۔ کہ جناب علیؑ کعبے میں پیدا ہوئے اور پیغمبر نے کہا کہ نبیؐ کا دامن وہ ہے جو خدا کے گھر سے آیا ہو۔ بلندیٔ خیال کے علاوہ بھی ایک چیز قابلِ لحاظ ہے۔ یعنی کسی شعر کے تیور پانا ہوں تو پہلے کو لب و لہجہ، اس عنوان سے اس رباعی پر نظر ڈالیے۔ کیا شاہانہ لہجہ ہے۔ حکمِ خدا، کا ٹکڑا منہ بولتا ہے حکمِ خدا سے کعبے میں ولادتِ علیؑ کا نتیجہ دوسرے مصرع میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کعبے کو علیؑ کی پیدائش سے شرف حاصل ہوا۔ یہاں لہجے کی بلندی قابلِ لحاظ ہے۔ اور پھر کعبے سے جناب علیؑ کی برآمدگی کہ نبیؐ اپنی گود میں لے کر نکلتے ہیں، دنیا کو دکھاتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں؛ •

لو ہم نے وصی خدا کے گھر سے پایا

اب ایک دوسرا مقام ملاحظہ ہو کہنا یہ مقصود ہے۔ کہ بعد شہادت جب سرِ مبارک کو نیزے پہ بلند کیا تو اس کا اثر کچھ اور ہی نمایاں ہوا سا فواجِ یزید کا مقصد تو یہ ہوگا کہ امام عالی مقام کا سر دنیا کو خوف زدہ کر دے گا۔ کہ یزید کی طاقت بھی کتنی بڑی طاقت ہے اور لوگ مجبور اطاعت ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا کچھ اور ہی دیکھنے والے چیخ اٹھے کہ کس صاحب کرامت کا سر ہے جو شہید بھی ہے اور غازی بھی اور نمازی بھی۔ ؎

کیا مرتبہ سلطانِ حجازی کا ہے کیا عزّو شرف امامِ غازی کا ہے
سجدہ کا نشاں دیکھ کے سب کہتے ہیں نیزے پہ یہ سر کس نمازی کا ہے

یہ بلاشبہ ایک عظیم رباعی ہے۔ لہجے میں فخر و مباہات کا وہ عالم ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ ایسا نازک موقع تھا کہ انیسؔ چاہتے تو حاضرینِ مجلس کو اپنی مرضی کے مطابق رُلاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ انیسؔ نے بظاہر ایسا نہیں کیا۔ اور رجزیہ انداز میں جھوم جھوم کر قصیدے کے رنگ میں سرِ مبارک کی تعریف کی ہے۔ یہ اس رباعی کا ایک رخ ہے اگر دوسری مرتبہ نظر ڈالی جائے تو چیخ نکل جاتی ہے۔ کہ وہ سر جو جسمِ امام پہ ہونا چاہیئے تھا نیزے پر ہے۔ نیزے کی رعایت ایک اور مقصد سے بھی برتی گئی ہے۔ وہ دن نہ تھا روزِ قیامت تھا۔ آفتاب سوا نیزے پر بھی نہ تھا سرِ مبارک دراصل آفتاب ہے۔ آفتاب کی پہچان روشنی سے ہوتی ہے۔ سرِ اقدس کی بھی یہ پہچان بتائی گئی ہے۔ وہ نورانی چہرہ جسے دیکھ کر پکار اٹھیں۔ ؎

نیزے پہ یہ سر کس نمازی کا ہے

حمد و معرفت میں انیسؔ نے عجب گل کھلائے ہیں ؎

لیکن انیسؔ عبد سے عبادت تیری فیض و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گر عصیاں میرے دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

یہ رباعی انیس کی خوش گوئی پر دلالت کرتی ہے۔ اگر ایک مرصع اور بامعنی رباعی کی مثال دینی ہو تو یہ رباعی پیش کی جا سکتی ہے۔ ایسی رباعیات پچھلی نسل تک شامل اوراد و وظائف خیال کی جاتی تھیں، یعنی اپنی کوتاہی اور بے بسی، اور حق تعالیٰ کی شانِ کریمی پر اعتماد بہ لحاظ مضمون اس رباعی میں چار مصرعوں کے اندر بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ پھر صحرا صحرا اور دریا دریا، اور اسی طرح عصیاں اور رحمت کی مناسبت نے رباعی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی آورد اور بے جا رعایتِ لفظی کا شائبہ بھی موجود نہیں۔ دو مشہور رباعیات اسی وضع کی اور بھی ہیں جو زبان زدِ خواص و عوام ہیں۔ ؎

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے　　　بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا　　　جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں　　　یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے　　　حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

پہلی رباعی میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو دوسری رباعی میں ہے۔ لیکن لہجے کا فرق ہے۔ دونوں رباعیات حمدیہ ہیں۔ پہلی رباعی میں شاعر ایک ناظرِ جلوہ ہے جو ہمہ اوست پکار اٹھتا ہے۔ ع

جس پھول کو سونگھتا ہوں بُو تیری ہے

وہ جلوہ، جو ہر ذرۂ کائنات میں ہے، شاعر بھی اسی کو تلاش کر رہا ہے اور ایک شاعر ہی پر منحصر نہیں ساری کائنات اسی دھن میں سرگرداں ہے۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے　　　بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے

جب شاعر اپنی منزل کی طرف اور بڑھتا ہے تو یکایک روزِ روشن کی طرح یہ راز اس پر منکشف ہوتا ہے۔ کہ جسے ہم ڈھونڈ رہے ہیں اور جسے ساری کائنات تلاش کر رہی ہے، وہ یہیں موجود ہے۔ وہ ہر پھول میں خوشبو بن کر اپنے وجود کا اعلان کر رہا ہے۔ دوسری رباعی میں بظاہر یہی کچھ کہا گیا ہے بلکہ اور بھی زوردار لہجے میں کہا گیا ہے۔ لیکن کثرتِ جلوہ آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی ہے ہر جگہ وہ موجود ہے اور اس کا بنایا ہوا عالم او رایسے ہی جانے کتنے عالم اور ہوں گے۔ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں حیرانی بھی ہے اور بے بسی بھی، لیکن ایک اور اشارہ بھی بین السطور ملتا ہے کہ مدتِ عمر کم ہے۔ اس قلیل مدت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام رنگا رنگ جلوے نظر میں سمولے جائیں۔ یعنی ماتم کوتاہیٔ عمر کا ہے۔

انیس کے کلام میں بے حاصلیِ حیات کا تصور بھی شدت سے موجود ہے۔ اس موضوع پر فارسی اور اردو رباعیات میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ زندگی ایک سراب ہے۔ محض مایا ہے۔ بے حقیقت ہے۔ کم وقعت ہے۔ اس مضمون سے مختلف

قسم کے فوائد حاصل کئے گئے ہیں۔ غلط قسم کے پیغام بھی دئے گئے ہیں۔ جب زندگی پر اختیار ہی نہیں تو کیوں نہ اس حیاتِ دو روزہ کو لہو و لعب اور عیش و نشاط میں بسر کیا جائے۔ کیوں نہ شراب نوشی اور حسن پرستی کو منزل قرار دیا جائے۔ انیسؔ ایک مصلحِ قوم تھے اور اُن کا مقصد اسلامی اقدار کی نشر و اشاعت تھا۔ وہ جا بجا عبرت دلاتے تھے۔ کہ دنیا سرائے فانی ہے۔ زندگی حقیقت کچھ نہیں۔ شباب ایک لمحۂ گذراں ہے۔ فنا ہی فنا ہے اور کچھ نہیں ؎

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے　　ہستی کو حباب آب دیکھا ہم نے
جب بند ہوئی آنکھ تو عقدہ یہ کھلا　　جو کچھ دیکھا، سو خواب دیکھا ہم نے

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہو گا　　جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہو گا
تنہائی میں آہ! کون ہووے گا انیسؔ　　ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہو گا

یاں سے نہ کسی کو ساتھ لے جائیں گے　　تنہا ہی لحد میں پاؤں پھیلائیں گے
کوئی نہ شریکِ حال ہو گا اپنا　　واللہ بس اعمال ہی کام آئیں گے

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کارخانۂ عالم ایک چیستان ہے۔ ایک معمّا ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ جس تک پہنچنا محال ہے۔ یہ تصور مختلف درس دے سکتا ہے۔ ساری بات شاعر کے کردار و شخصیت کی ہے۔ اگر شاعر نیک کردار کا مالک ہو گا اور اعلیٰ اقدار کا مبلغ ہو گا تو اس کا پیغام کچھ اور ہو گا۔ اور بصورتِ دیگر زندگی کیا ہے دیوانگی ہے۔ پھر ہمیں غم کھانے کی ضرورت نہیں۔ راوی عیش لکھتا ہے۔ بارود کے ڈھیر پر بھی بیٹھ کر انجام سے بے خبر رہنا اور نوشا نوش میں لگے رہنا ہی علاجِ حیات کا حل ہے ؎

کچھ عقل کی میزان میں تولا نہ گیا　　چپ ہو گئے اس طرح کہ بولا نہ گیا
عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیسؔ　　یہ بندِ اجل کسی سے کھولا نہ گیا

اسی خیال سے منسلک ایک اور خیال ہے ؎

لالے سے عیاں بہار سرجوشی ہے　　نرگس کو جو دیکھئے تو مدہوشی ہے
کیسی یہ گو مگو ہے اے ربِّ کلیم　　بلبل نالاں ہے گل کو خاموشی ہے

لیکن ان حالات میں انیسؔ پیغام دیتے ہیں کہ جب دنیا ایسی ہے تو عقبیٰ کی فکر کرنی چاہیئے ؎

جس شخص کو عقبیٰ کی طلبگاری ہے — دنیا سے ہمیشہ اُسے بیزاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں — غافل یہ خواب ہے وہ بیداری ہے

غرضکہ رباعیاتِ انیس "اخلاقی مضامین کا ایک گنجِ گرانمایہ ہیں۔ ہر طرف موتی بکھرے پڑے ہیں۔ کوئی چننے تو کہاں تک چنے۔ اخلاقی مضامین پر انیس و دبیر کے زمانے میں خصوصیت کے ساتھ زور اس لئے دیا جاتا تھا کہ مرثیے کی فضا کے ساتھ اخلاقی مضامین کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو پہچانے، میر انیس خود شناسی کے مرتبے پر فائز تھے۔ اور جانتے تھے کہ اُردو شاعری کو اور اسلامی تہذیب کو انہوں نے کیا کچھ دیا ہے۔ وہ اپنی شاعری پر نازاں تھے۔ یہ امر باعثِ حیرانی نہ ہونا چاہیئے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ اپنے کو شاعرِ اہلِ بیتؑ کہتے تھے۔ سے

بالیدہ ہوں، وہ اوج مجھے آج ملا — ظلِ علمِ صاحبِ معراج ملا
منبر پہ نشست، سر پہ حضرت کا علَم — اب چاہیئے کیا، تخت ملا تاج ملا

اللہ اللہ اِس رباعی کے کیا ٹھاٹھ ہیں۔ شاعرانہ تعلّی ہمارے شعراء کا عام شیوہ رہا ہے۔ لیکن یہاں نازاں بلند بات یہ ہے۔ کہ سفرِ معراج امام عالی مقام ہے۔ ایسی ہی ایک عظیم رباعی دبیرؔ کی خواص و عوام کی نوکِ زبان پر ہے۔

مدّاحِ امیر ابنِ امیر آتا ہے — دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاقِ سخن خلق چلی آتی ہے — لو مرثیہ پڑھنے کو دبیرؔ آتا ہے

آفریں ہے انیس و دبیر پر، جنہوں نے اپنی زندگی کا محور بنایا تو اخلاقِ حسنہ کو بنایا۔ اور جنہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو صرف کیا۔ تو اسلامی اقدار کی نشر و تبلیغ میں صرف کیا۔ جو قوتیں قدرت کی طرف سے ہمیں عطا ہوئی ہیں ان کو ہم خواہ غلط راستے پر ڈال دیں خواہ صحیح راستے پر، شاعرانہ صلاحیت بھی ایسی ہی ایک قوت ہے۔ افسوس کہ ہمارے عظیم شعراء نے بھی اپنی شاعری کو حرص و ہوس کے مضامین تک رکھا ہے۔ برخلاف اس کے انیس کی مثال اُبھرتے ہوئے سورج کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہ شاعری کے ذریعے انہوں نے اسلامی اقدار کو پھیلانے اور امام عالی مقام کی یاد کو تازہ کرنے کا فرض انجام دیا۔ یہ بات تو بہت لمبی ہے۔ مختصر چند رباعیات کے ذریعے ہم نے یہی بات سمجھانی چاہی ہے۔

سرشار صدیقی

میر انیس کی منظر نگاری کے چند نادر نمونے

انیس کی ریاضتِ فن رنگ لائی، ان کی دعا کو قبولیت ملی۔ قدرت نے ان کی طبع رسا کو ایسے پھول بخشے جن کی مہک اس سے پہلے کبھی محسوس نہ کی گئی تھی۔

حق و باطل کا کوئی معرکہ ہو، ظالم و مظلوم کا کوئی واقعہ ہو، مجبوریوں اور محرومیوں کا کوئی مرحلہ ہو ہمارا ذہن دشت کربلا کے کرداروں سے زندگی کی ساری مثالیں مستعار لے لیتا ہے۔ سچائی کے اظہار کی جرأت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے تاریخ میں بے شمار ناموں کے سلسلے ملتے ہیں۔ یہ سارے نام انسانیت کے لئے قابل احترام ہیں کہ ان کے ہونے صداقت کا پرچم بلند کیا ان کی قربانیوں نے جبر و استبداد کو سرنگوں کر دیا۔ ان کے کردار نے انسان کے حوصلے بلند کئے۔

لیکن ان تمام ناموں میں ایک نام سب سے زیادہ محترم ہے کہ جس نے ایثار، قربانی، صداقت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ جس نے قیامت تک آنے والی نسل آدم کو حق پرستی اور باطل شکنی کا ایسا درس دیا ہے کہ زمان و مکان کی تمام قید و بند اس کی تازگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں جب کبھی کہیں بھی معرکۂ خیر و شر برپا ہوگا۔ حق و باطل کی صفیں آراستہ ہوں گی، غاصبوں اور مطالبۂ حق کرنے والوں کا مقابلہ ہوگا یہی نام مجبوروں اور زیر دستوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہوگا۔ یہی نام جو تاریخ انسانیت کی پیشانی پر مہر شہادت بن کر ثبت ہے۔ جب تہذیب کے وسیلے سے ادب عالیہ میں داخل ہوتا ہے۔ تو جرأت، شجاعت اور حق پرستی کا سب سے عظیم استعارہ بن جاتا ہے۔

میر انیس، دوسرے ماتم گساران کربلا کی طرح اسی استعارے کے نام لیوا ہیں اور اسی نام کی نسبت کی بدولت اپنے تمام ہم عصروں اور ہم مشربوں میں سب سے ممتاز و نمایاں ہیں۔ یہ امتیاز ان کے خلوصِ فکر، خلوصِ نیت، خلوصِ فن، کے علاوہ ان تمناؤں اور ریاض کا نتیجہ بھی ہے۔ جو ان کی دعاؤں میں شامل ہیں۔

یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر   اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر   گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

انیس کی ریاضت رنگ لائی، ان کی دعا کو قبولیت ملی اور قدرت نے ان کی طبع رسا کو واقعی ایسے پھول بخشے جن کی مہک پہلے کبھی نہ محسوس کی گئی تھی۔ ان کی تمام شاعری ایسے ہی گل ہائے تازہ و شگفتہ کا چمن زار ہے اور ناقدینِ فن کی اس اجتماعی رائے میں بڑی صداقت نظر آتی ہے۔ کہ انیس پر مرثیہ گوئی ختم ہو گئی۔

کلام انیس کے بے شمار محاسن میں ان کی منظر نگاری کو درجہ کمال حاصل ہے۔ ہر چند کہ اظہار کے وسیلوں میں شاعری سب سے نازک وسیلۂ اظہار ہے اور شاعری میں منظر کشی کا مرحلہ کیفیات نگاری کا سب سے مشکل مقام ہے۔ لیکن میر انیس اردو کے وہ واحد شاعر ہیں جن کے کلام میں جگہ جگہ پر منظر نگاری کے بے شمار نادر نمونے ملتے ہیں۔ یہ نمونے نہ صرف میر انیس کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت ہیں۔ بلکہ منظر نگاری کے موضوع پر پوری اردو شاعری کی تہی دامنی کا ازالہ کرتے ہیں۔

عام طور پر منظر نگاری کے سلسلے میں صرف یہ تصور ہے کہ الفاظ کے ذریعہ کسی منظر قدرت کی تصویر کھینچ دی جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ منظر نگاری کو صرف مناظر قدرت کی تصویر کشی تک محدود کر دینا تصور کی بے کراں وسعتوں اور مشاہدات کے لامحدود امکانات کے ساتھ ناانصافی ہے۔ کیونکہ مناظر قدرت خارجی مظاہر ہیں اور ایک اخلاقی شاعر کے تصور کی گہرائی اور گیرائی صرف ان خارجی مظاہر کی تصویر کشی سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔

میر انیس کی منظر نگاری اس تنوع پسندی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ جب وہ مناظرِ قدرت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صبح کے سہانے سماں کا نقشہ کھینچتے ہیں تو لفظوں سے کلیوں کے چٹکنے کی آواز آتی ہے اور کرنوں کی نرم و نازک روشنی چھلکنے لگتی ہے:۔

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

اس طرح میر انیس گرمیوں کی دوپہر کی تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ دوپہر عرب کے ریگزار کربلا کے صحرا اور وحشتِ غربت

دوپہر کی ہے:

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے ۔۔۔ آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے ۔۔۔ گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

انیس نا قابلِ فہم استعارے استعمال کئے بغیر اپنے تصور کو تصویر میں منتقل کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ گرمی کی یہی کیفیت صرف دو مصرعوں میں کتنی مکمل اور جامع ہے:۔

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

ان تصاویر کے ساتھ ساتھ میر انیس نے انسان کے داخلی محسوسات کی منظر کشی کا حق بھی ادا کیا ——— وہ احساسِ تنہائی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے ۔۔۔ ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے ۔۔۔ یاں نہ بیٹا، نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
"مار لو پیاسے کو" ہے شور ستمگاروں میں

اس نوع کا ایک اور نازک احساس لفظوں کے وسیلے سے تصویر بن کر ابھرتا ہے۔ یہ بے چارگی اور محرومی کے ساتھ ساتھ احتیاط اور صبر کے رنگوں کی آمیزش سے عبارت ہے:۔

آج اس زمین پہ ہمیں لایا ہے آسماں ۔۔۔ اب دیکھئے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں ۔۔۔ یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے
بھائی! بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

کربلا کا وہ معرکہ خیر و شر جس میں دو متضاد قوتیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ان قوتوں میں ایک کی تعداد مٹھی بھر ایسے انسانوں پر مشتمل ہے۔ جن میں پردہ نشین خواتین کے ساتھ ساتھ شیر خوار بچے، ضعیف و بیمار انسان بھی شامل ہیں۔ اور دوسری طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور نیزہ، تلوار، خنجر اور بھالوں کی آنکھیں خیرہ کرنے والی چمک میر انیس ان دونوں کی تصویر بناتے ہیں:۔

سنتا ہوں میں، ہیں دو پسر شاہِ نامدار — بیمار ان میں ایک ہے اور ایک شیرخوار
زینبؑ کے دو ہیں، انہیں حسنؑ کے ہیں گلعذار — دس ہیں عقیلؑ و مسلمؑ و حیدرؑ کے یادگار
زہراؑ کے جان و دل ہیں محمدؐ کے پیارے ہیں
یہ سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

چاند کی تشبیہ کے ذریعہ خانوادۂ رسولؐ کے جگر گوشوں کا ذکر کرنے کے بعد میر انیسؔ آسمانِ شہادت کے ستاروں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

بتیس سب سوار شہِ دیں کے پاس ہیں — اب رہ گئے پیادے، سو، دو کم پچاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر باحواس ہیں — غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں
کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
سجدے ہیں اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے

اور اب حریف کی فوج کی نقشہ کشی کی باری ہے۔ تاریخی حقائق کی پابندیاں اور شاعری کے تقاضوں کی نزاکتوں کے باوجود میر انیسؔ اس کٹھن منزل سے کتنی سلاست روی کے ساتھ گزر جاتے ہیں:۔

بولا وہ تب کہ ہوں گے جواں یاں کئی ہزار — خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
ہیں تین چار کوس کے گردے میں سب سوار — اک اک جواں ہے رستمِ میدانِ کارزار
کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف — خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
جل باز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف — اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
سب لوگ فکرِ قتلِ شہنشاہِ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرزِ گاؤسر — ضربت سے جن کے ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہر جا کھچی ہوئی ہیں کمانیں اِدھر اُدھر — کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پہ
سب لوگ جا بجا پئے قتل و ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اُپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

میر انیسؔ کی منظر نگاری کے سلسلے میں مختصراً اگر یہ کہا جائے کہ ان کا ہر شعر، ہر مصرع اور حتیٰ کہ ہر لفظ اپنی ایک واضح

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

ذاکر محمد قاسم

انیس کی زمینِ شعر ہے ادب کا آسماں

در صنعتِ توشیح

ب۔ بفیضِ عامِ مصطفٰےؐ، بفضلِ خالقِ جہاں ‏ س۔ سجا کے شعر کی زمیں بنا لئے میں نے آسماں

ب بلندیوں سے ماورا ہے فنِ شاعری مرا ‏ ی۔ یقیں مرا ہے پاسباں بیاں مرا نگاہباں

ر۔ رئیسِ ملکِ فکر ہوں امیرِ شہرِ ذکر ہوں ‏ ن۔ نظیرِ شاعری مری دیارِ شعر میں کہاں

ع۔ عطا کیا ہے شعر کو وہ رنگ و نور و کیفِ نو ‏ ا۔ ادب رہے گا جاوداں بہر زماں بہر مکاں

ل۔ لہو سے دل کے سینچ کر زمینِ فنِ شعر کو ‏ ی۔ یہاں وہاں بکھیر دی بہارِ حسنِ جاوداں

ی یہ کارنامۂ قلم وہ رشحِ نوربار ہے ‏ ل۔ لپک میں جس کی ہے رواں شعورِ فن کا کارواں

ا۔ ادیب ہوں کہ فلسفی طبیب ہوں کہ جوہری ‏ ع۔ عدو اڑا نہ پائیں گے مرے بیاں کی دھجیاں

ن۔ نبیؐ کے عزمِ پاک کا خدا کے دینِ خاص کا ‏ ر۔ رسالت و کتاب کا میں پاسباں ہوں بیگماں

ی۔ یہاں وہاں اِدھر اُدھر زمیں پہ آسماں پہ ‏ ب۔ بلند ہے حسینؑ کے عمل سے دین کا نشاں

س۔ سلیقہ سے رواں دواں ہے مرثیوں کی راہ میں ‏ ب۔ بلاغتوں کا قافلہ، فصاحتوں کا کارواں

سخنوروں سے ناقدوں سے کہہ دو ذاکر آج تم

انیس کی زمینِ شعر ہے ادب کا آسماں

تجسس اعجازی

تضمین برسلامِ انیس

تلاشِ اشکِ غمِ شہ ہے آستینوں کو
ضیائے چہرۂ شبرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق

درِ حسینؑ کی ہے جستجو جبینوں کو
شبیہہِ ساقیٔ کوثرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق

ہے کربلا کی تمنا حرم نشینوں کو
جمالِ عکس پیمبرؐ سے تھا حسینؑ کو عشق

"سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
بجا ہے اس لئے اکبرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق

ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو"
کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو"

نگوں سے بھر دیا قدرت نے جب زمینوں کو
تھے آفتابِ امامت علیؑ کے نور العین

گہر بنا دیا شبنم کے آبگینوں کو
چھلک رہا تھا تجلی سے دامنِ کونین

سنوارا قاسمؑ و اکبرؑ سے مہ جبینوں کو
حسنؑ کے ساتھ ہی معراج پا رہے تھے حسینؑ

"پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
یہ غل تھا مہرِ نبوت پہ جب چڑھے حسنینؑ

خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو"
جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو"

مہک رہا ہے شمیم بہشت سے گلزار
ہر ایک غنچے کی رگ رگ میں دوڑتی ہے بہار
ہے میرے پیشِ نظر مدحِ حیدرِ کرّار
"لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو"

چھڑی ہے جنگ قیامت کی کفر و ایماں میں
پڑی ہے تھرتھری باطل کے قصر و ایواں میں
ہے شورِ نعرۂ تکبیر دشتِ امکاں میں
"حسینؑ جاتے ہیں بہرِ نبرد میداں میں
چڑھائے مثلِ یداللہ آستینوں کو"

پلا رہا ہوں میں حبِّ علیؑ کے ساغر مفت
بجا ہے تلخیٔ الفاظ گر نظر ہو درست
مزاجِ ناقدِ کج فہم ہے ازل سے دُرشت
"غلط ہے لفظ وہ بندش بری یہ مضموں سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو"

حبیب بولے کیا کام خوش ضمیری نے
حجاب اٹھا دئے موجِ مئے غدیری نے
جواں بنا دیا سرّور کی دستگیری نے
"یہ جھُرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو"

صدائے طبل جب آئی عدو کے حلقے سے
نگاہ تیغ پہ ڈالی جری نے غصے سے
بپھر کے شیر برآمد ہو جیسے بیشے سے
"علم لئے ہوئے عباسؑ نکلے خیمے سے
چڑھا لیا علیؑ اکبر نے آستینوں کو"

صدا حبیبؓ کی آئی اٹھائے شہؑ نے قدم
بلند کر دیا کچھ اور بھی وفا کا علم
بتا رہا ہے یہ کردارِ سیّدِ عالم
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"

سید محمود الحسن نیرنگ
بھوپالی

تضمین بر سلامِ انیس

دارِ محنت تھی یہ دنیا کی سرا میرے لئے   دمبدم تھی تازہ ایذا و جفا میرے لئے
ہو گیا دردِ اجل آخر دوا میرے لئے   "خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے
شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے"

تھی تجھے نذرِ سے مجھے مولائے بوذر سے ولا   ربِّ عالم نے دیا دونوں کی محنت کا صلا
تجھ کو سونا مجھ کو سونا زیرِ خاکِ کربلا   اے مہوّس قسمت اپنی اپنی اسکا رشک کیا
"کیمیا تیرے لئے خاکِ شفا میرے لئے"

جب تلک جیتا یونہی آنسو بہاتا مثلِ شمع   جس کے ہاتھ آتا وہی مجھ کو جلاتا مثلِ شمع
سوزشِ دل کے سوا کیا اور پاتا مثلِ شمع   "نام روشن کر کے کیونکر بجھ نہ جاتا مثلِ شمع
ناموافق تھی زمانہ کی ہوا میرے لئے"

حشر میں کیا بارِ عصیاں سے کیا ہے سرنگوں   سامنے آنکھوں کے ہے فہرستِ اعمالِ زبوں
میرے مالک میں بھلا اس کے سوا اب کیا کہوں   "بھیج دے دوزخ میں یا جنت میں ہاں مجرم تو ہوں
تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لئے"

ہجر میں جب دخترِ شبیرؑ کرتی تھی بُکا   مادرِ عباس کہتی تھیں نہ رو وُ میں فدا
دل سنبھالو ہوش میں آؤ پیو بی بی دوا   "کہتی تھی صغرا اٹھنڈائی سے نہ ہوگی شفا
شربتِ دیدارِ اکبر ہے دوا میرے لئے"

فیض گوہر جعفری

خدائے سخن

خدیوِ مملکتِ فکر و فن! خدائے سخن! ترے کلام سے زندہ ہے ارتقائے سخن
تمام عمر بسر مدحِ اہلبیت میں کی بلند کتنا رہا تیرا مدعائے سخن
تو اپنے دَور کا فردوسی و نظامی ہے ہوئی ہے تیرے تخیل پہ انتہائے سخن
ترے مقام کے قائل ہیں شبلی و حالی ہر آشنائے ادب ہے ترا فدائے سخن
حسینیتؑ نے اسے زندگی عطا کی ہے بندھی رہے گی جہاں میں تری ہوائے سخن
تری نظر میں تھے ابلاغِ فکر کے اسلوب اسی لئے تجھے کہتے ہیں رہنمائے سخن
کی مرثیہ میں جو جدت پسند طبع تری نہ چھوڑا کوئی بھی گوشہ نیا برائے سخن
محال ہے کہ کوئی اس پہ کرسکے ایزاد وہ تو نے ڈالی ہے اک مستقل بنائے سخن
اسی کو فن نے ترے بحرِ بے کنار کیا زمانہ جس کو سمجھتا تھا تنگنائے سخن
تری زبان کا مزہ اہلِ ذوق لیتے ہیں ترے بیاں کو سمجھتے ہیں آشنائے سخن
رہے گا زندۂ جاوید تو بہ فیضِ حسینؑ نہ ہوسکے گی کبھی کم تری جلائے سخن

نکھرتی جائیگی اردو زباں کے ساتھ ہی ساتھ
جو فکر نے ہے ترے وضع کی فضائے سخن

جناب آغا محمد نقوی زائر امروہوی

شعر کی جنت انیس اور نظم کا کوثر انیس

فطرتِ انسانیت کا معتبر مصدر انیس　　ذکر کیا بندوں کا خالق نے پڑھا پیہم درود
واقعاتِ کربلا کا مستند دفتر انیس　　جب ہوئے نسلِ محمدؐ کے ثناگستر انیس

مرثیے ان کے کشش ہے انہیں گویا حیات　　اللہ اللہ شاعرِ آلِ نبیؐ کا یہ شرف
ذاکرِ شبیرؑ ہیں بعد از فنا گرچہ انیس　　شاہ ہیں فرشِ عزا پر اور سرِ منبر انیس

منتخب گلدستۂ اشعار و سخن ہر مرثیہ　　ہے زباں دانی میں زائرؔ ان کی یہ ادنیٰ ثنا
مل گئے لفظوں کے کیا کیا اچھے اچھے گوہر انیس　　شعر کی جنت انیس اور نظم کا کوثر انیس

میرانیس کی منظر نگاری کے چند نادر نمونے ——— بقیہ صفحہ ۶۸

صورت رفتار تو یہ نقشہ نہ ہوگا۔ پھر بھی حسینؑ کے نام لیوا کی وہ تصویریں نہایت اہم اور قیمتی ہیں جن کا براہ راست تعلق بھی کربلا کی منزل سے ہے۔

مصور فطرت [illegible] ہیں جب [illegible] تصویر اور [illegible] گھر منظر [illegible] کی شہادت کا منظر [illegible] میرانیس نے اس تصویر میں خون جگر [illegible] ہوگا۔

تھا حصہ [illegible] [illegible] شوق آیا　　جب [illegible] سنبھل کر سر [illegible] کو جھکایا
[illegible] حلق سے [illegible] ہوا　　زہراؑ کی صدا آئی [illegible] ہوا جایا
قاتل [illegible] فریاد ہے [illegible] زہراؑ
فرزند [illegible] ہے بہت جان [illegible] زہراؑ

پروفیسر سید وقار عظیم

انیس کے مراثی قومی شاعری کا مستقل سانچا بن گئے

مسدس حالی اور اقبال کا شکوہ انیس کے فن کارانہ تصرف کا عکس ہیں

منبر اور انیس کے باہمی رشتے کی اہمیت اور معنویت کا احساس اب سے ایک صدی پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا۔ وہ اہمیت اور معنویت آج ایک صدی بعد جب ہم انیس کی صد سالہ برسی منانے کے اہتمام میں مصروف ہیں، زیادہ ابھر کر اور زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ منبر پر بیٹھ کر مجلس میں مرثیہ پڑھنے کی جس رسم کے آغاز کا سہرا ضمیر کے سر ہے۔ انیس کی فنی بصیرت اور فن کارانہ تخلیقی عمل کی بدولت وہ رسم ہماری ادبی، شعری اور تہذیبی روایت کا مستقل حصہ بن چکی ہے اور اس روایت کی آغوش میں شاعری کی ایسی صنف نے پرورش پائی ہے جو اپنی مخصوص اور منفرد و امتیازی خصوصیات کے ساتھ صرف اردو ہی میں موجود ہے کسی اور زبان میں نہیں۔ اب سے سو سوا سو برس پہلے کے لکھنؤ، بنارس، الٰہ آباد، پٹنہ یا حیدرآباد کی کسی مجلس کا تصور کیجئے۔ جو ہزاروں معتقدین اور شائقین کو کشاں کشاں اپنی طرف لاتی ہے۔ یہاں انیس کو مرثیہ پڑھنا ہے جمع ہونے والوں کے دلوں میں عقیدت مندی کی اٹھتی ہوئی جذبے کی لہروں کا ایک تلاطم ہے اور سب اس وقت کے منتظر ہیں۔ جب وہ ایک شہرۂ آفاق منبر نشین کی زبان سے سید الشہداء کا ذکر سن کر داخل حسنات ہوں گے۔ مرثیہ سن کر ان پر رقت طاری ہوگی اور یہ رقت ان کے لئے وسیلۂ نجات بنے گی۔ جمع ہونے والے عقیدت مندوں کے دلوں میں حصول ثواب کی آرزو کے ساتھ ساتھ ایک والہانہ شوق بھی ہے کہ یہ ذکر جس لطیف شاعرانہ انداز میں کیا جائے گا، اس سے ان کے ذوق شعر و [illegible] کے انبساط کا [illegible] سرمایہ بھی فراہم ہوگا۔ اور جب پڑھنے والے کی آواز اور لہجے کے زیر و بم اور اس کے متناسب اعضا کی موزوں جنبشوں سے جذبات اور واردات کے مرقعے جیتے جاگتے ہو کر نظر کے سامنے ابھریں گے تو تصویر پر تصویر میں انہیں ایک ایسے عالم کا نقشہ نظر آئے گا جس کا دیدار [illegible] ان کی نظر کے لئے ایک عظیم سعادت ہے۔ مرثیہ گو اپنے سامعین کے جذبات کی رفعت اور ان کے ذوق کی لطافت و نفاست کا علم رکھتا ہے اسے ان کی توقعات کا بھی پورا اندازہ ہے اور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا بھی پورا احساس ہے اس لئے منبر پر بیٹھ کر اسے مجلس میں ایسا مرثیہ پڑھنا ہے جس سے عقیدت مندوں کی حصول ثواب کی آرزو بھی پوری ہو جائے اور جو ان کے اس ذوقِ سلیم کی تسکین کا باعث بھی بن سکے جو حصول ثواب کی آرزو کے پس پردہ کروٹیں لے رہا ہے ایک تیسری بات اور بھی ہے اور وہ ہے خود مرثیہ نگار جسے ایک مخصوص معاشرہ، ماحول اور مجلسوں کی فضا نے منبر نشین اور مرثیہ خواں بھی بنا دیا۔ اپنی [illegible] کے مطابق [illegible] مرثیہ گوئی کو وہ خود اپنے لئے [illegible] سمجھتا

ہے۔ اس لئے اس کی تربیت و تنظیم میں وہ اپنے جذبے کے پورے اجلال کے ساتھ ساتھ فکر اور تخیل اور پوری قوت بھی صرف کرنا چاہتا ہے، اسے علم ہے کہ اس کے جذبے، فکر اور تخیل کے امتزاج اور آمیزش سے اشعار کا جو سلسلہ مرتب ہوگا اس کی حیثیت شاعر کی طرف سے شہدائے کربلا کی خدمت میں ایک حقیر نذرانے کی ہوگی۔ اس لئے جب وہ بارگاہِ ربّ العزت میں دستِ دعا پھیلاتا ہے تو اس کی مانگی ہوئی دعاؤں میں وہ سارے احساسات شامل ہوتے ہیں جو ایک عقیدت مند مسلمان کی حیثیت سے ایک معروف مرثیہ گو کی حیثیت سے اور ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی اس کی دعا یہ صورت اختیار کرتی ہے :۔

غوّاص طبیعت کو عطا کر وہ لآلی ہو جن کی جگہ تاجِ سرِ عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی
سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر ان کی یہ ہوں گے جنہیں رشتہ ہے نبی سے

اور کبھی اس کا تصور اس کے فن کا لازمۂ عمل کے لئے یہ تصویر تیار کرتا ہے :۔

بزم کا رنگ جُدا رزم کا میداں ہے جُدا یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جُدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جُدا مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جُدا
دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو

"دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو" میں انیس کی مرثیہ گوئی کے فنی پہلوؤں کے کئی رشتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک رشتہ مرثیہ گو اور اہلِ بیتؑ کا ذکر مرثیے کا موضوع ہے۔ دوسرا رشتہ مرثیہ گو اور اس کے سامعین کا ہے جو اس کا مرثیہ اس لئے سُن رہے ہیں کہ اس میں مصائبِ اہلبیت کا بیان ہے اور دوسرے اس لئے کہ ان مصائب کے بیان میں مرثیہ گو نے شاعرانہ روایت کے تمام فنی تقاضوں کو بڑی چابکدستی سے برتا ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ فنی تقاضوں کا احساس اور انہیں پوری چابکدستی کے ساتھ برتنے کا ارادی عمل منبر اور مرثیہ گو کے باہمی تعلق کی ایک مخصوص نوعیت کا پیدا کیا ہوا ہے۔

انیس کو جس سننے اور پڑھنے والے کے لئے مرثیے لکھنے ہیں اس کے ذوق کی پرورش، شاعری کے ایسے عہد میں ہوئی ہے جس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے بڑے واضح معیار ہیں۔ وہ شعر میں صرف اس حقیقت اور اس کی صداقت کو حقیقت اور صداقت تسلیم کرتا ہے جس میں مبالغہ، اغراق، اور غلو کی جھلک پہنچے۔ اس کے نزدیک تخیل کی وہی پرواز صحیح شاعرانہ پرواز ہے جو بلندی میں اوجِ ثریا تک جائے اور اس کی وہی جدت، جدت ہے جو فکر کی حدوں سے نکل کر ناممکن کی حدود میں سفر کرنے کو اپنا شیوہ بنائے۔ یہاں برہانِ نادر اور امثال تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے بھی جائے اور صنعتیں اس طرح برتی جائیں کہ کلام کی عمارت

کا ایک ایک گوشہ مصور و منقش نظر آئے۔ اس ذوقِ شعری میں جہاں تکلف، رنگینی، مبالغہ اور صنعت گری اچھے شعر کی خصوصیت میں، وہاں دوسری طرف وہ روزمرہ کی سلاست، محاورے کے برمحل صرف اور لفظوں اور ترکیبوں کی چستی اور بندش کو بھی حسنِ کلام کی جان سمجھتا ہے۔ انیس نے مرثیوں کے حسنِ تعمیر میں اپنے عہد کے اسی ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کیا ہے۔ اور اس معاملے میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار میں کسی طرح کے تکلف اور انکسار سے کام لینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں　　بحرِ مواجِ فصاحت میں تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذرّے کو انجم کر دوں　　گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلم کر دوں
درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں　　قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہرِ منور سے ملا دوں　　خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

لیکن انیس نے تخیل کی جولانیوں اور بلند پروازیوں اور حسنِ بیان کی نادرہ کاریوں کو اپنی قدرتِ کلام کے عناصر لازمہ کے باوجود اس احساس کو اپنا رہنما بنایا ہے کہ

ع　"ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد"

اس لئے جہاں انھوں نے اپنے کلام میں واقعات کے ایسے مرقعے بنائے ہیں۔ جن کا نظارہ مانی و بہزاد کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کرتا ہے۔ وہاں اپنے موئے قلم کو عمل کے کچھ ضابطے بھی سکھائے ہیں۔ لفظ مغلق نہ ہو، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو، اور پھر

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی　　لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کی عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہو، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

مرثیہ گوئی اور مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مرثیت کی جو روایت انیس تک پہنچی اور شاعرانہ قدروں کی جو روایت تغیر کے اثرات قبول کرتی ہوئی اس ماحول میں داخل ہوئی۔ جہاں انیس کی ذہنی پرورش ہوئی، ان دونوں کے حسین، لطیف اور کامل

امتزاج سے انہوں نے ایسا مرثیہ تعمیر کیا جو فکر و تخیل اور بیان کے توازن اور تناسب کا بہترین مرقع ہے۔ اس مرثیے نے مرثیے کی روایت کو بعض نئی اور انوکھی چیزیں دیں۔ لیکن ان انوکھی چیزوں میں سب سے انوکھی یہ ہے کہ انیس کے بعد آنے والے مرثیہ نگار کے لئے مرثیت اور شعریت کو ایک دوسرے سے الگ کرنا اور الگ رکھنا ناممکن ہو گیا۔ مرثیے میں "تفکر"، تخیل اور حسن بیان نے یوں جگہ پائی کہ ایسے مرثیے کا تصور ممکن نہیں رہا جس میں جذبے کی شدت اور صداقت کو فکر کی گہرائی، تخیل کی گیرائی اور اظہار کی رعنائی کی رفاقت حاصل نہ ہو، یہ بات اس مرثیے پر بھی صادق آتی ہے۔ جس میں خیال کا مرکز کربلائے معلٰی میں ہونے والی شہادتِ عظمٰی سے تعلق رکھنے والے واقعات ہیں۔ اور اس مرثیے پر بھی جس کا موضوع کسی ایک فرد کی دائمی جدائی کا غم ہے۔ حالی کے مرثیے، اقبال کے مرثیے اور چکبست کے بعض مرثیے اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

واقعہ نگاری اور سیرت نگاری کے نقطۂ نظر سے، واقعہ نگاری میں حقیقت اور تخییل کے امتزاج سے، ایک تازہ حقیقت کی تخلیق کے لحاظ اور سیرت کشی میں مکالموں کی بلاغت کے اعتبار سے، انیس کے مرثیے نے اس صنف کو جو معنوی اور فنی وسعت دی اُس سے قطع نظر مرثیے کی وہ ہیئت جسے انیس سے پہلے سے بھی مسلسل خیال کے اظہار کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ انیس کے فن کارانہ تصرف کے بعد قومی شاعری کا ایک مستقل سانچا بن گئی۔ حالی کے مسدس اور اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ میں اسی کا عکس ہے۔

اِس سوال کے جواب میں کہ انیس کے اسلوبِ مرثیہ نگاری کی کس حد تک تقلید اور پیروی کی گئی۔ کرار صاحب نے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ انیس نے مرثیے کی شاعری کے ذریعے زمینِ شعر پر جو درخت لگایا ہے اس کا چھتر اتنا گھنا ہے کہ اس کے سائے تلے لگتے ہوئے کسی پودے کا پروان چڑھنا ممکن نہیں، اِس لئے جنہوں نے انیس کی روایت کو اپنایا۔ انہوں نے اس سائے سے الگ ہٹ کر اس کے چاروں طرف اپنی کشت لگائی اور گلشن جمائے۔ ان لگائی ہوئی کھیتیوں پر دُور سے انیس کا سایہ پڑ رہا ہے۔ اور وہ اپنی اپنی قوت اور استعداد نمو سے لہلہاتی نظر آ رہی ہیں، یہ بات کتنی سچ ہے۔ اس کا اندازہ انیس سے بہت قریب کے زمانے میں نفیس اور پیارے صاحب رشید کی لگائی ہوئی کھیتیوں کو دیکھ کر ہوتا ہے البتہ ان کے زمانے سے دور خود اپنے زمانے میں سید آلِ رضا اور جوش ملیح آبادی کے مرثیے دیکھ کر جن میں تفکر اور حکمت کا رنگ زیادہ ابھر کر اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔

مولانا سید محمد جعفر

کلامِ انیس

عالم کائنات میں جو کچھ بھی ہے فانی ہے بقا کسی شے کو بھی نہیں۔ دستِ فنا ایسا شہ زور ہے کہ اس کے سامنے ہر قوی کمزور بلکہ بے بس اور بے زور ہے۔ مخلوقِ ارضی ہی پر منحصر نہیں ارض و سما پست و بالا حیّن و بشر، خشک و تر، شمس و قمر زیر و زبر، فلک و ملک سب ہی اس دائرۂ فنا میں محصور ہیں۔ جو ہے وہ فنا اور موت کے لئے یہاں تک کہ موت ملک الموت کے لئے۔ آنا علامت ہے جانے کی اور ہونا دلیل ہے نہ ہونے کی۔

بقا صرف ایک کے لئے ہے ورنہ فنا ہر ایک کے لئے۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ فنا کے ہاتھ سے کسی طرح چھٹکارا نہیں تو ہار کر چاہتا ہے کہ میرے بعد میرا تذکرہ ہی باقی رہے۔ سمجھتا ہے کہ اولاد ہو گی تو اس سے میرا نام و نشان رہے گا اولاد کی آرزو کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس آرزو کے پورا ہونے کے بعد بھی اصل آرزو خاک میں مل جاتی ہے۔ چند پشتوں کے بعد اولادیں بھی کوئی اس کا نام و نشان تک نہیں جانتا۔ کوئی اپنے لئے یادگار سمجھ کر باغ لگاتا ہے کوئی عالی شان عمارت بناتا ہے۔ لیکن باغ ہے تلف ہونے کے لئے اور عمارت ہے منہدم ہونے کے لئے تصویریں کھنچوائی جاتی ہیں۔ کہ ہمارے بعد ہماری مصنوعی شکل ہی رہ جائے۔ لیکن اصل شکل ہی نہ رہے تو یہ نقلی کیا رہے؟ اور کب تک رہے۔ فانی کے لئے ہر یادگار فانی، یہ یادگاریں کچھ دنوں رہیں بھی تو برائے نام ہی رہیں کیونکہ ان چیزوں میں یہ صلاحیت کہاں کہ مرنے والے کے وہ صفات و کمالات دکھا سکیں جو اس کی ذات میں مجتمع تھے۔ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا اور دیرپا وہ یادگار ہے جو صاحب کلام کے کلام سے وابستہ ہے۔ کلام متکلم کے عیب و ہنر کا وہ آئینہ ہے جو متکلم کے قصد و ارادہ کے بغیر خود بخود اس کی اصلی سیرت کے ہر پہلو کو نمایاں کرتا رہتا ہے۔ انسان جب تک خاموش ہے اس کے عیب و ہنر چھپے ہوتے ہیں۔ لیکن بولتے ہی یہ پردہ چاک ہو جاتا ہے اور عیب و ہنر جو کچھ بھی ہے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے "تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔" کلام سے محض صفاتِ کلام ہی واضح نہیں ہوتے۔ بلکہ کلام سے متکلم کے وہ صفات بھی واضح ہو جاتے ہیں جن کے اظہار کا متکلم کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ کلام متکلم کے ان تمام صفات کا نقشہ خود بخود کھینچ دیتا ہے۔ جن سے کلام کا بظاہر کوئی تعلق بھی نہ ہو۔ کلام بتا دیتا ہے کہ متکلم اس وقت مضطرب ہے یا مطمئن، پُر امید ہے یا مایوس، تندرست ہے یا بیمار، جوان ہے یا پیر، خفیف الحرکات ہے یا سنجیدہ، با ہمت ہے یا بے ہمت، خود غرض ہے یا غیور، امیر ہے یا مامور، جامد ہے یا محمود قانع ہے یا طامع، متلون ہے یا محکم، امام ہے یا ماموم، حاکم ہے یا محکوم، خطاکار ہے یا معصوم، نیک ہے یا بد، عالم ہے یا جاہل!

نبی ہے یا اُمّت، خالق ہے یا مخلوق۔ غرضیکہ کلام کا دیکھنے والا یا سننے والا اپنی صلاحیت کے بقدر متکلم کے کلام سے اس کے صفات و حالات اور رازہائے درون کا پتہ چلا سکتا ہے۔ لہٰذا صاحبِ کلام فانی ہو یا باقی اس کی بہترین یادگار اور اس کے صفات کا آئینہ دار اُس کا کلام ہے۔ خدا کے کلام سے شانِ ربوبیت نظر آئے گی۔ رسولؐ کے کلام سے شانِ رسالت، امام کے کلام سے شانِ امامت، عالم کے کلام سے شانِ علم اور کامل کے کلام سے شانِ کمال غرضیکہ متکلم جس کیفیت اور جس حیثیت میں ہے اس کے کلام سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی کے کلام کو اگر صاحبِ نظر تعمّق نظر سے دیکھے تو پھر وہ صاحبِ کلام کے دیکھنے سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر کیا کہنا اس کلام کا جو دنیا میں مقبول و مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ مقبولِ بارگاہ خدائے جلیل اور آخرت کے لئے سببِ اجرِ جزیل ہو۔ یقیناً اس مقام پر حمدِ خدا اور مدحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کرنے والے حضرات ہیں۔ اس سلسلہ میں نثر ہو یا نظم دونوں چیزوں کا مقام بلند ہے۔ لیکن نثر چونکہ آسانی سے زبان زدِ خاص و عام نہیں ہو سکتی اور نظم کی طرح ایک دم دل نشین اور محفوظ نہیں ہوتی اس لئے نظم کی تاثیر و تسخیر ایک مسلم امر ہے۔

موجودہ زمانہ میں نظم کو شعر اور صاحبِ نظم کو عموماً شاعر کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بناء پر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ شعر و شاعری کی قرآن کریم نے مذمت کی ہے۔ لہٰذا دفع دخل کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہر مفہوم کے لئے ہر زمانہ میں ایک لفظ کا استعمال ضروری نہیں ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس مفہوم کے لئے کسی زمانہ میں جو لفظ تھا آگے چل کر اسی مفہوم کے لئے پہلے لفظ کی جگہ دوسرے لفظ نے لے لی اور اب اس مفہوم کے لئے دوسرا لفظ بولا جانے لگا۔ مفہوم کے لئے الفاظ بھی بدلتے رہتے ہیں اور الفاظ کے لئے مفہوم بھی یعنی کسی زمانہ میں مفہوم کے لئے کوئی لفظ اور کسی زمانہ میں کوئی لفظ اسی طرح کسی زمانہ میں ایک لفظ کا مفہوم کچھ تھا اور کسی زمانہ میں کچھ۔ مدح ہو یا مذمت لفظ کی نہیں ہوتی مفہوم کی ہوتی ہے الفاظ کے لئے مفہوم اور مفہوم کے لئے الفاظ کی ادل بدل ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً آج لفظ معجزہ عموماً بولا جاتا ہے اور اس کا مفہوم بھی ذہنوں میں موجود ہے۔ مسلمان معجزاتِ انبیاء و ائمہ کے قائل ہیں لیکن قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن کریم نے معجزاتِ انبیاء کا ذکر ہی نہیں کیا۔ قرآن کریم نے اس مفہوم کے لئے لفظ آیات و بینات کا کہیں صیغۂ واحد اور کہیں صیغۂ جمع میں استعمال کیا ہے۔ اسی طرح لفظ معصوم آج زبان زد ہے۔ اس لفظ کا مفہوم بھی ایک حد تک ذہنوں میں ہے۔ لیکن انبیاء اور ائمہ کا تذکرہ قرآن مجید میں جا بجا ہے۔ ان کے لئے لفظ معصوم کہیں نہیں کہا گیا۔ لیکن اس سے انبیاء اور ائمہ کی نفیِ عصمت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو مفہوم آج لفظ معصوم کا ہے۔ اور لفظ معصوم آج جس مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس مفہوم کے لئے قرآن کریم نے مخلصین، صادقین اور مطہرین کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

شعر اور شاعر کی قرآن کریم نے مذمت ضرور کی ہے اس وقت شعر کا مفہوم یہ نہ تھا جو اب ہے۔ ورنہ کفار قرآن کو شعر اور نبی کو شاعر ہرگز نہ کہتے۔ اس وقت شعر کا مفہوم تو گویا ہرزہ سرائی اور بیہودہ گوئی تھا چاہے وہ نثر ہی میں ہو۔ لیکن آج شعر کا

مفہوم ہے۔ وزن خاص سے کلام کو موزوں کرنا یہ موزوں کلام اپنے مضمون کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ باخیر بھی ہو سکتا ہے اور موجب ثواب بھی اور اس کے برعکس بھی۔

عجب نہیں کہ روزہ میں شعر پڑھنا جو شرعاً مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہی شعر ہو جس کے معنی بیہودہ گوئی کے ہیں۔ خواہ وہ نظم ہو یا نثر کیونکہ یہ بات تو لائق تسلیم نہیں ہے کہ روزہ میں وہ بیہودہ گوئی مکروہ نہ ہو جو نثر میں کی جائے۔

میں اگرچہ شاعر نہیں ہوں لیکن تھوڑا بہت ذوقِ کلام رکھتا ہوں۔ میرا یہ تمام تر مقالہ شہنشاہِ اقالیم سخن میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ کے تصور میں ہے۔ میرے نزدیک نظم کے جس قدر بھی فنون و کمالات ہیں۔ انیس کا کلام ان سے بھرپور ہے۔ کلام کی خوبیاں کو الگ الگ گنانا اور دکھانا آسان نہیں ہے۔ چند چیزیں بطور مثال بیان کی جاتی ہیں۔ ہر کلام میں الفاظ کو مناسب ترین محل پر رکھنا ہر کلام کی وہ خوبی ہے جو حدِ کمال پر پہونچ جائے۔ تو وہ کلام معجزہ ہے۔ اور اس کی ایک ہی مثال ہے۔ جس کو مثالی بے مثال کہا جائے تو درست ہے۔ یعنی کلام اللہ جو حسنِ کمال کا کلام ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں وہی الفاظ ہیں جو پہلے سے زبان میں موجود تھے۔ اگر قرآن کے لئے نئے الفاظ وضع کئے جاتے تو اس کو عربی نہیں کہا جا سکتا (؟)۔ وہی مستعمل الفاظ جب استعمالِ قدرت میں آتے ہیں تو جن وانس بھی مل کر اس کی مثل نہیں لا سکتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ علیم کمال نے الفاظ کے نظم و ترتیب کو اس حدِ کمال پر پہونچا دیا جس کے بعد کمال کا یعنی متناسب ترتیب الفاظ کا درجہ ہی نہیں۔ بہر حال کلام کے حسن، محل کشش اور تاثیر میں الفاظ کی مناسب ترتیب کو بڑا دخل ہے۔ کلام کی برتری کے لئے ضروری ہے کہ ترتیب الفاظ ایسے عنوان سے ہو کہ تصنع اور تکلف کی جھلک بھی نہ ہو اور سننے والا یہ محسوس نہ کرے کہ الفاظ کو جہاں جہاں بٹھایا ہے۔ زبردستی اور بالجبر بٹھایا ہے۔ ایسے اشعار بہترین اشعار قرار پائیں گے۔ جن میں سادگی کے ساتھ ساتھ ترتیب الفاظ عام بول چال کے یا بالکل مطابق ہو یا قریب تر ہو۔ یعنی اس نظم کی نثر کی جائے تو یا تو وہ نظم ہی عین نثر ہو جائے اور کسی بھی لفظ کو مقدم موخر نہ کرنا پڑے یا نثر کرنے میں اگر کچھ مقدم موخر کرنا بھی پڑے تو وہ تغیر نہایت خفیف اور غیر محسوس ہو۔ کاملین کے بعض اشعار ایسے نظر آتے ہیں جن کی نثر کرنے میں ترتیب کو مطلقاً بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ نظم علیٰ حالہٖ بول چال کی نثر ہے۔ ایسی مثالیں عربی، فارسی، اُردو میں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہ قطعہ مشہور و معروف ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ وآلہٖ

عربی زبان ہونے کی وجہ سے ہم اس کلام کی پوری خوبی کو نہیں سمجھتے۔ اس نظم میں مخصوص کمال یہ ہے کہ اس کی نثر کرنے میں کسی ایک حرف کو بھی ادھر اُدھر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو لفظ جہاں ہے وہ بغیر تکلف کے قواعد کے لحاظ سے اپنے اصل مقام پر ہے۔ لہٰذا جو نظم ہے وہی اس کی نثر ہے۔

یہی حال ان دونوں الہامی شعروں کا ہے جن کو نادِ علی کہا جاتا ہے۔

ناد علیاً مظہر العجائب تجدہٗ عوناً لک فی النوائب کل ہمّ و غمّ سینجلی بعزّ بعزّ بعلیّ

ان دونوں شعروں کی نثر بالکل وہی ہے جو نظم ہے۔ ہر لفظ بقاعدۂ نثر اپنی جگہ ہے۔ ممکن ہے کہ بعض عربی داں حضرات کی بھی توجہ اس خوبی کی طرف نہ ہوئی ہو۔

اِسی وصف کی مثال میں آنے والا اُردو شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کی نظر میں وہ موقع ہے کہ امام حسین علیہ السلام اپنے بچپن میں سواری کے نہ ہونے کی وجہ سے روٹھے ہوئے ہیں۔ ناز بردار نانا اپنے فرزند کو روٹھا ہوا دیکھ کر حسینؑ سے فرماتے ہیں ؎

جب آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں
اچھا سوار ہو جیے ہم اونٹ بنتے ہیں — انیسؔ

یہ شعر بھی نثر کی بول چال میں ہے۔ جس کی نثر کرنے کے لئے کسی لفظ کی تقدیم و تاخیر کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ نثر یوں بن جائے۔ "جب آپ" کے "آپ جب" کہا جائے لیکن "جب آپ" بھی نثر کے منافی نہیں ہے۔ بہرحال نظم جس قدر بھی زیادہ سے زیادہ مطابق نثر ہو گی اور بول چال سے جتنی بھی قریب تر ہو گی اتنی ہی کامیاب اور مؤثر ہو گی۔ یہ وصف انیسؔ کے یہاں بڑی خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ جو واقعہ سنایا جائے اور جو منظر پیش کیا جائے وہ محض سنایا ہی نہ جائے بلکہ دکھایا جائے۔ سننے والے کی سماعت سماعت سے آگے بڑھ کر بصارت بن جائے۔ اور سامع کو یہ محسوس ہو کہ وہ بچشم خود دیکھ رہا ہے۔ انیسؔ کے یہاں یہ وصف بحد کمال ہے۔

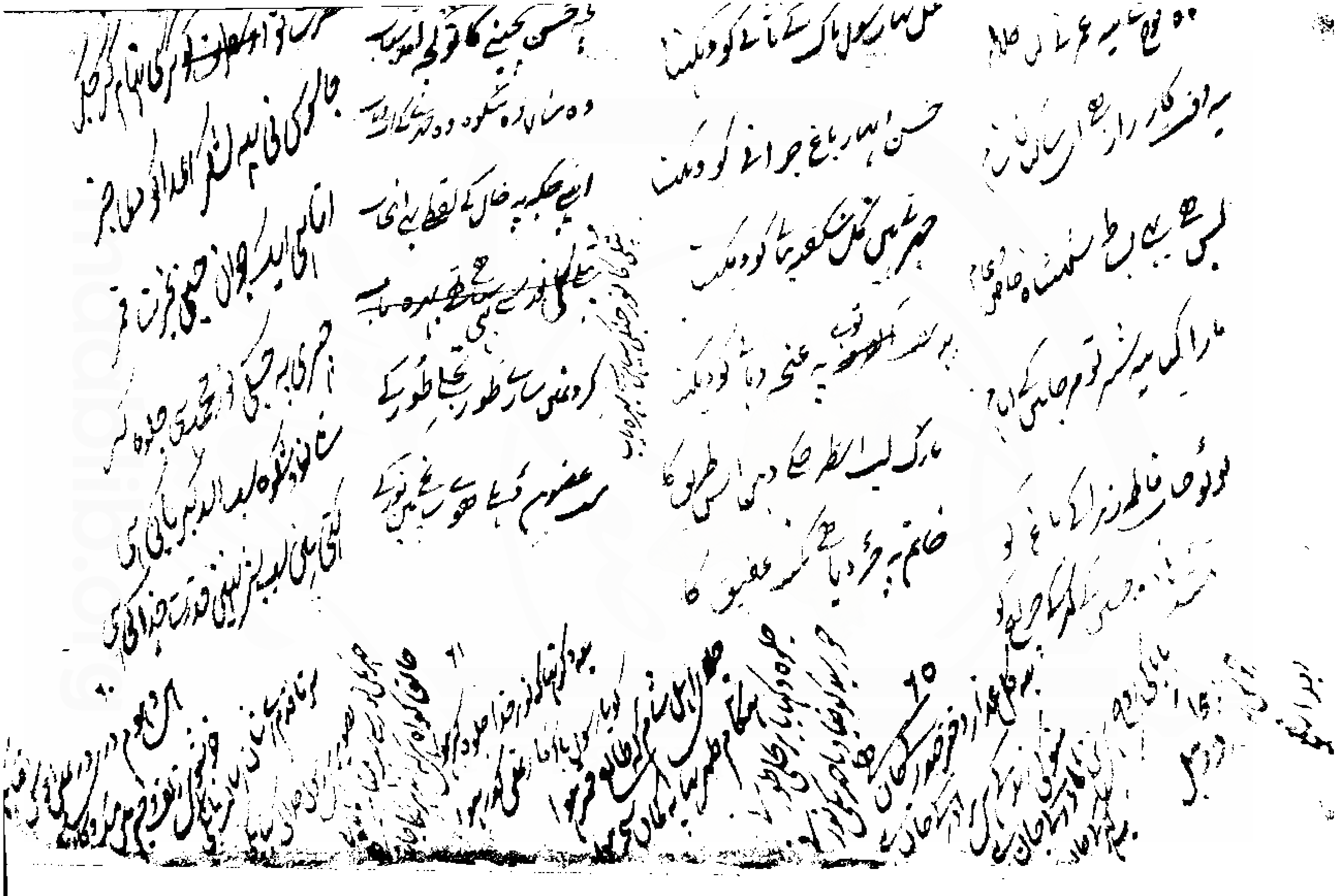
اسی طرح مبالغہ شاعری کی جان ہے۔ لیکن مبالغہ اگر مبالغہ نظر آئے تو شاعری ہی کیا ہوئی۔ باکمال شاعر کی صنعت یہ ہے کہ وہ مبالغہ کتنا ہی زبردست اور از کار بلکہ غیر ممکن الوقوع ہو بیان ایسے عنوان سے کیا جائے کہ سننے والے کو چون و چرا کے بغیر یقین آتا چلا جائے اور کسی ہوشمند کو بھی اس وقت یہ سوچنے کا موقع نہ ملے کہ یہ بات ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ کلام کی تسخیر کا یہ عالم ہو کہ فلسفہ اور دلیل کی طرف توجہ ہی نہ ہو سکے۔ مواقع اور مناظر کے پیش کرنے وقت انیسؔ کی یہ عظیم خصوصیت ہے۔ غرضکہ انیسؔ کے یہاں کلام کے وہ تمام لفظی اور معنوی صفات مکمل موجود ہیں۔ جن کی بنا پر ان کو اقالیم سخن کا شہنشاہ کہنا غلط نہیں پھر عمر بسر کی مرحوم نے تو کلام اسی کلام میں جو دنیا و آخرت، دونوں جہان میں ان کی سربلندی کارسازی اور سرفرازی کا سبب ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ

دعائے خیر

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ بتصدق اسیرانِ کربلا ان پاکستانیوں کو جو ہندوستان کی قید میں ہیں جلد رہائی دلائے۔



میر انیسؒ



بند نمبر ۶۳ ، ۶۴ میں انیس کے قلم سے ہے اور بند نمبر ۶۴ ، ۶۲ پر اصلاح بھی انہی کے قلم سے ہے (مرتضیٰ حسین - فاضل)

سید یوسف حسین شائق لکھنوی
(فرزند سجارف)

کلامِ انیس میں درسِ اخلاق

میر انیس مرحوم کا تقریباً کل کلام تین اصناف شاعری پر مشتمل ملتا ہے۔ اوّل مرثیہ دوسرے سلام تیسرے رباعی۔ ان کے کلام میں اوّلیت مرثیہ کو حاصل ہے۔ رباعی اور سلام وہ اس لئے نظم کرتے تھے کہ منبر پر مرثیہ شروع کرنے سے پہلے اہل مجلس کے سامنے پڑھے جانے کا طریقہ عام طور سے رائج تھا۔ مجلس میں مرثیہ سے پہلے دو ایک ذاکر چند رباعیاں اور معمولاً ایک سلام پڑھ کر منبر سے اتر جاتے تھے اس کے بعد مرثیہ خوان زیب منبر ہوتا تھا اور وہ خود بھی دو ایک رباعیاں اور چند شعر سلام کے پڑھنے کے بعد مرثیہ شروع کرتا تھا۔

میر انیس کی وفات کو پوری ایک صدی گذر چکی ہے اور اس مدت میں بہت سے اہل قلم ان کے کلام اور ان کے حالات زندگی کے متعلق مضامین اور مستقل کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ جہاں تک ان کے کلام پر تنقید اور تبصرہ کا تعلق ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ اسی حد تک پہونچا ہے۔ جہاں تک ان کے ذوقِ سخن اور سخن فہمی کی رسائی تھی۔ آپ نے مثل سنی ہوگی کہ "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔ کسی چیز کی پوری قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے قابل وہی شخص ہو سکتا ہے جس کی نظر سے اس قسم کی چیزیں پہلے نظر سے گذر چکی ہوں اور وہ ان چیزوں کے حسن و قبح کے پرکھنے میں مہارت رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک عمدہ مصور کی بنائی ہوئی تصویر کی قدر ایک اسی کے پایہ کا مصور کر سکتا ہے۔ ادنیٰ درجہ کا مصور بھی اس کی کما حقہ قدر نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ ایک عام آدمی جو تصویر کشی کے فن ہی کو نہ جانتا ہو۔ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ لوگوں نے میر انیس کے کلام کی ان کے زمانے میں بھی قدر کی اور آج تک لوگ قدر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر کیا عام لوگ جو خود شاعر نہیں ہیں یا ہیں بھی تو ان کے ہم پلہ شاعر نہیں ہیں۔ ان کے کلام کی پوری قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ اس نظریہ کی بنا پر تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوائے ان چند اہل کمال کے جو میر انیس کے زمانے میں موجود تھے کسی نے ان کے کلام کی پوری قدر نہیں جانی۔

یہ بات اپنی جگہ پر کتنی ہی درست سہی لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میر انیس کے عہد میں بھی اور ان کے بعد سے آج تک، کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے میر انیس کے کلام سے پوری پوری لذت حاصل کی اور ان کے کلام کے مرتبے کو سمجھا۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو خدا کی طرف سے ذوقِ سلیم عطا ہوا۔ ذوقِ سلیم کیا ہے۔ اس کو لفظوں میں سمجھانا بہت مشکل ہے۔ یہ میرے خیال میں ایسی نادر اور کمیاب صفت ہے جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی باریک قوتِ احساس ہے جس کی بدولت شعر کو سننے والا شعر کے عمیق اور دور رس نفسیاتی نکتہ کو محسوس کر کے ایسی لذت پا لیتا ہے۔ جو اسے بڑی سے بڑی عشرت سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کی نظر سے کسی شعر کا ادنیٰ سے ادنیٰ نقص یا عیب بھی چھپا نہیں رہتا کیونکہ اس کا ذوقِ سلیم شعر کی خامی یا اس کے عیب کو

بھی فوراً محسوس کرلیتا ہے۔ یہ ذوقِ سلیم ہی ہے جو شعر کی کسوٹی ہے۔ ایک شعر اپنی تمام فنی خوبیوں کے باوجود ذوقِ سلیم کے معیار پر پورا نہ اترنے کے بعد اپنی منزل سے گر جاتا ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں شعر فہمی کا کمال اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس کے ساتھ ذوقِ سلیم کا عنصر بھی کارفرما ہو۔ اسی نکتہ کو کسی شاعر نے اس شعر میں ادا کیا ہے :

شعر گفتن گرچہ درسفتن بود لیک فہمیدن بر از گفتن بود

ذوقِ سلیم کے سلسلہ میں اتنا لکھنے کے بعد بھی میں سمجھتا ہوں کہ پورے طور سے اس کی وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے میں کچھ ذاتی مثالوں سے اسے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک صاحب نے ایک صحبت میں میرے سامنے یہ شعر پڑھا :

ہم کو دو آنسو کوئی رو کر دکھائے مسکرا دینا تو کچھ مشکل نہیں

یہ شعر سن کر مجھ پر ایسی وارفتگی طاری ہوئی جس کے بیان سے میں قاصر ہوں۔ میں دل ہی دل میں اس کی لطافت کا مزا لیتا رہا۔ اس شعر میں محبت کے جذبہ کو جس لطافت کے ساتھ ادا کیا گیا ہے کہ ذوقِ سلیم ہی اس سے لذت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ شعر سنے ہوئے مجھے چالیس سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے۔ مگر آج تک میرے حافظہ میں محفوظ ہے اور آج بھی اس میں وہی لذت باقی ہے۔

اسی طرح عزیز لکھنوی کے دیوان میں ایک غزل میں نے دیکھی جس کا مطلع یہ تھا :

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے تڑپ پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے

یہ شعر مجھے بہت پسند آیا مگر میرے ذوق نے اس میں تشنگی محسوس کی۔ پھر میں نے اس شعر کو اپنی جگہ اس طرح پڑھا :

تڑپ پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے

صرف اتنے تغیر کے بعد کہ پہلے مصرع کو دوسرا اور دوسرے کو پہلا کر دیا۔ میرے مذاق کی تشنگی رفع ہو گئی اور میرے خیال میں یہ شعر اپنی منزل سے بہت بلند اور دلکش ہو گیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی سمجھاتا چلوں کہ میرے ذوق کو تشنگی کیوں پیدا ہوئی اور کیوں رفع ہوئی۔ اصول کلیہ یہ ہے کہ ہمیشہ کیفیت یا حالت پہلے طاری ہوتی ہے اور اس کا اثر بعد میں مرتب ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کوئی خطا یا غلطی کرتے ہیں اور ہم کو ندامت یا پشیمانی ہوتی ہے۔ بیشک خطا یا غلطی مقدم ہے۔ اور ندامت یا پشیمانی کی منزل اس کے بعد ہے کیا کبھی بر عکس ہے کہ ندامت پہلے ہو جائے اور غلطی بعد میں سرزد ہو۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح دیگر کیفیات کو لیجئے مثلاً حسرت، یاس، تاسف وغیرہ ہمیشہ تابع ہوں گے اپنے ماقبل کی حالت کے۔ اس لئے مذکورہ شعر میں موجودہ حالت یعنی "تڑپ پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے" کا اظہار پہلے ہونا چاہیئے تھا اور اس کے اثر سے جو تاسف پیدا ہوا یعنی "جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے" کا ذکر بعد میں ہونا چاہیئے تھا یہی باریکیاں ہیں جنہیں ذوقِ سلیم اپنی کسوٹی پر کستا ہے اور اپنے معیار پر جانچتا ہے۔

مذکورہ بیان ہمارے موضوع سے کچھ الگ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے ذریعہ سے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میر انیس کا کلام سمجھنے کے لئے اتنا آسان نہیں ہے جتنا اسے عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ بقول خود میر انیس مرحوم کے :

بینائے رقومات ہنر چاہیئے اس کو سودا ہے جواہر کا نظر چاہیئے اس کو

جو حضرات اب تک میر انیس اور ان کے کلام کے سلسلے میں قلم فرمائی کرچکے ہیں انہوں نے فنی اعتبار سے ان کی شاعری کے تقریباً کسی پہلو کو قلبند کرنے سے نہیں چھوڑا ہے۔ ہم یہاں میر انیس کے کلام کے اس پہلو کو متعین کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے درسِ اخلاق کو کس حد تک نمایاں کیا ہے۔ ان کے کلام کے اس پہلو کو موضوع بنانے کا صرف یہ مقصد ہے کہ اس کی رُوح سے عامتہ الناس کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔ کیونکہ اخلاقی قدریں کسی کی ملک نہیں ہوتیں بلکہ ہر انسان ان سے فائدہ حاصل کرنے کا برابر سے حقدار ہے نہ وہ کسی قوم سے مخصوص ہیں نہ کسی مذہب وملت سے وابستہ ہیں۔

میری نگاہ میں میر انیس کے کلام کی تینوں صنفوں میں بیشتر حصہ ایسا ہے جو اخلاقی تعلیمات سے مملوٗ ہے۔ انہوں نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا۔ دنیا وما فیہا پر اپنے مخصوص اندازِ فکر کے ساتھ نظر ڈالی۔ ان سے نتائج اخذ کئے اور ان حقائق کا اظہار کیا جو روزمرّہ ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن دنیا سے محبت رکھنے کے باعث ہم ان کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ میر انیس نے ایسے ہی حقائق کو اپنے دلکش انداز میں بیان کیا ہے مثلاً انسان کی زندگی چند روزہ ہے۔ موت ہر شخص کے لئے ناگزیر ہے۔ انسان اپنے ساتھ مالِ دنیا سے کوئی چیز نہیں لے جاتا۔ دولت انسان میں غرور وتکبر پیدا کردیتی ہے۔ یہی حقائق ہیں جن پر غور وتامل کرکے انسان اپنے کو خوش اخلاقی اور خوش کرداری کے زیور سے آراستہ کرسکتا ہے۔

اب میں میر انیس مرحوم کے کلام سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جنہیں پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں کہ وہ فنی لطافتوں کے ساتھ آپ کے ضمیر کو کس حد تک بیدار کرتے ہیں اور آپ ان خیالات سے متاثر ہوکر اپنے کردار میں کتنی بلندی پیدا کرسکتے ہیں۔ عام دنیاوی زندگی کی تصویر کشی میر انیس اس طرح کرتے ہیں کہ آپ کو دنیا اور علائق دنیا سے نفرت ہوجائے۔ اور یہ تصویر بالکل حقائق کی روشنی میں ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اس منزلِ فانی میں دل اپنا نہ لگاؤ ۔۔۔ الفت نہ کرو اس سے جسے چھوڑ کے جاؤ
یہ عاریتی جا ہے یہاں گھر نہ بناؤ ۔۔۔ پابندیِ دنیا سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ
پھر چلتے ہوئے ہرگز کوئی کام آ نہ سکے گا ۔۔۔ ہمراہ کچھ اسبابِ جہاں جا نہ سکے گا

یاں رخصتِ اقامت کا سرانجام ہے لے جا ۔۔۔ اس منزلِ پُرخوف میں آرام ہے لے جا
عقبیٰ کے سوا یاں کا ہراک کام ہے لے جا ۔۔۔ مانندِ نگیں آرزوے نام ہے لے جا
جینے میں یہ دم شلِ چراغِ سحری ہے ۔۔۔ کر لو عملِ خیر یہی ناموری ہے

اُمید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام ۔۔۔ ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشیدِ لبِ بام
یاں کام کرو ایسا کہ جو آئے وہاں کام ۔۔۔ آ پہونچے خدا جانئے کب موت کا پیغام

[illegible] نہ کوئی ملک نہ املاک سمجھنا　　ہونا ہے تمہیں خاک یہ سب خاک سمجھنا

دنیا میں سدا ایک سا رہتا نہیں اقبال　　ادبار ہے انساں کا کبھی اور کبھی اقبال
اندوختہ کرتے جسے لگتا ہے مہ و سال　　آجاتا ہے وہ غیر کے قبضے میں زر و مال
خالی رہیں گے بعدِ فنا ہاتھ تمہارے　　کچھ جمع ہو ایسی کہ چلے ساتھ تمہارے

نہ بھائی ہی کام آئے گا اس وقت نہ فرزند　　عرصہ نہیں، کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہووے رضامند　　ہشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند
پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے　　آرام گہِ شاہ و گدا کنجِ لحد ہے

ہیں زیرِ زمیں صاحبِ تخت و علم و تاج　　جو صاحبِ نوبت ہے نشاں ان کے نہیں آج
جو شاہ کہ شاہوں سے سدا لیتے رہے باج　　وہ بعدِ فنا آپ کفن کے رہے محتاج
درویش و غنی اس سے ہمیشہ رہے شاکی　　بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی

کیا سخت گھڑی ہوگی اجل آئے گی جس دم　　کھینچ کھینچ کے ہر اک رگ سے نکلنے لگے گا دم
کیا دیکھیں گے ایک ایک کو حسرت سے بصد غم　　اتنی بھی زباں ہل نہ سکے گی کہ چلے ہم
سب کے لئے اک روز یہ تکلیف دھری ہے　　اس پر بھی یہ غفلت ہے عجب بے خبری ہے

بھائی نہیں اپنے بہن نہیں ہے پسر اپنا　　بیگانے ہیں سب ہوئیگا جس دم سفر اپنا
نہ مال نہ اسباب نہ زیور نہ زر اپنا　　دو گز کفن اور قبر کا گوشہ ہے گھر اپنا
کچھ ساتھ بجز بیکسی و یاس نہ ہوگا　　رہ جائیں گے سب دور کوئی پاس نہ ہوگا

اس زیست پہ پھولو نہ، اجل کو بھی کرو یاد　　گھر سینکڑوں یاں سیلِ فنا نے کئے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد　　اس قالبِ خاکی کی عجب سست ہے بنیاد
کل اوج پہ جو لوگ تھے وہ زیرِ زمیں ہیں　　ہے خاک کا ڈھیر اب نہ مکاں ہیں نہ مکیں ہیں

کس کس گلِ رنگیں کی نہ اِس باغ میں تھی دھوم　　اک آن میں شبنم کی طرح ہو گئے معدوم
دکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستیِ موہوم　　کیا قصد ہے گلچینِ اجل کا نہیں معلوم
اِس باغ میں جس سرو کو دیکھا وہ رواں ہے　　جس گل پہ بہار آج ہے کل اُس پہ خزاں ہے

ایک اور مرثیہ میں ایسی ہی حقیقتیں ہیں جن کی طرف میر انیسؔ لوگوں کو اپنے مخصوص انداز میں توجہ دلاتے ہیں اگر ہمیں توفیق ہو تو ان سے عبرت حاصل کریں۔

جیتا ہے ہمیشہ کوئی اِس دارِ محن میں؟　　یہ روح ہے مہماں کوئی دن خانۂ تن میں
ہے آج بہار، اور خزاں کل ہے چمن میں　　ہم سے بہت ایسے ہیں کہ سوتے ہیں کفن میں
ہر شام کو دس بیس چراغِ سحری ہیں　　ہر صبح کو دس لُٹتے ہیں، اور دس سفری ہیں

جاری ہے سدا حکم تغیری و بحالی　　موہوم ہے جاہ و حشم ملکی و مالی
گھر ہوتا ہے آباد کوئی اور کوئی خالی　　ہو جاتی ہے عورت کوئی بے وارث و والی
آباد کوئی ہوتا ہے لُٹ جاتا ہے کوئی　　پھنستا ہے کوئی قید میں چھُٹ جاتا ہے کوئی

اس باغ میں بے زر ہے کوئی اور کوئی زردار　　صحت سے کوئی صورتِ نرگس کوئی بیمار
آزاد ہے گر سرو تو قمری ہے گرفتار　　گل ہیں جو چمن میں کسی جا گر تو کہیں خار
اشکوں سے رخِ گل کو سدا دھوتی ہے شبنم　　غنچے تو ہنسے دیتے ہیں اور روتی ہے شبنم

شادی ہے کسی شخص کو غم کھاتا ہے کوئی　　خلعت کوئی پاتا ہے کفن پاتا ہے کوئی
آتا ہے جہاں میں کوئی اور جاتا ہے کوئی　　کھلتا ہے کوئی پھول تو مُرجھاتا ہے کوئی
گر غور سے دیکھو تو بھروسا نہیں دم کا　　دنیا بھی مرقع ہے عجب شادی و غم کا

گر تختہ ہے تابوت ہے گر مسندِ شاہی　　اک آتا ہے دنیا میں تو اک ہوتا ہے راہی
بس خیر ہے جب تک کہ رہے فضلِ الٰہی　　کچھ بن نہیں پڑتا ہے جو آتی ہے تباہی
سلطاں بھی کفن کے لئے محتاج ہوئے ہیں　　لاکھوں گھر اسی طرح سے تاراج ہوئے ہیں

آرام کی جا گر نہیں یہ غمکدۂ دہر   گھر سیکڑوں ڈوبے ہیں یہ دریا ہے وہ پُر قہر
ویراں وہ نظر آتے ہیں آباد تھے جو شہر   شیرینی دنیا ہے مسافر کے لئے زہر
زندہ ہے اگر آج بھروسہ نہیں کل کا   چکھے گا ہر اک ذائقہ تلخیٔ اجل کا

گھبرائے نہ کس طرح مسافر کا تنِ زار   نہ راحلہ نہ زاد نہ رہبر نہ مددگار
وہ جرم کی پرسش وہ نکیرین کی گفتار   وہ قبر کی وحشت وہ غریبی وہ شبِ تار
غفلت ہے اسے موت کا دھڑکا نہیں جسکو   درپیش ہے وہ راہ کہ دیکھا نہیں جس کو

کام آئیں گے تربت میں نہ ازواج نہ اطفال   نہ ملک نہ جاگیر نہ منصب نہ زر و مال
وہ کیا ہیں کہ جو ساتھ نہ چھوڑیں کے بہر حال   اعمال ہیں اعمال ہیں اعمال ہیں اعمال
ہمدرد بجز بیکسی و یاس نہ ہو گا   سوئیں گے لحد میں تو کوئی پاس نہ ہوگا

اب ہم میر انیس مرحوم کے سلاموں کے چند شعر اور کچھ رباعیاں پیش کرتے ہیں جو اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان میں مرثیہ کی طرح کا تسلسل موجود نہیں ہے۔ سلام میں چونکہ ایک تخیّل ایک ہی شعر تک محدود رہتی ہے اس لئے اس میں کلام میں تسلسل پیدا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ہر شعر ایک علیحدہ اخلاقی قدر کا حامل ہے۔ رباعی کی شان دوسری ہوتی ہے اس میں ایک مضمون کو چار مصرعوں میں پورا کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ سلام کا ہر شعر اور ہر رباعی خود اپنے موضوع کو ظاہر کر دے گی۔ سلاموں کے چند شعر یہ ہیں:

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں   وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا   ہر ایک ذرّے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں
کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں   کہ جس کو فخرِ رسالت مآب سمجھے ہیں
بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نانِ خشک کو ہم   اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں
ارے نہ آئیو دنیائے دُوں کے دھوکے میں   سراب ہے یہ جسے موجِ آب سمجھے ہیں
انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو   اسی زمین کو ہم فرشِ خواب سمجھے ہیں

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے   سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں
دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر   آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے   کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے
قناعت و گہر آبرو و دولت دیں   ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے
ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منّت خلق   وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

اب ہم ان کی چند رباعیاں پیش کرتے ہیں۔ جن سے پڑھنے والا عبرت و نصیحت حاصل کر سکتا ہے :-

جس دن کہ فراق روح و تن میں ہوگا   مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت نو پہن کر غافل   اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

اندیشۂ باطل سحر و شام کیا   عقبیٰ کا نہ ہائے کچھ سرانجام کیا
ناکام چلے جہاں سے افسوس انیسؔ   کس کام کو یاں آئے تھے کیا کام کیا

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے   ہستی کو حباب آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھلا   جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں   یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ دولت استغنا سے   آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

مانا ہم نے کہ عیب سے پاک ہے تو   مغرور نہ ہو صاحب ادراک ہے تو
بالفرض گر آسماں پہ ہے تیرا دماغ   انجام کو سوچ لے کہ پھر خاک ہے تو

دل میں غم یاران وطن لے کے چلے   اس باغ سے داغوں کا چمن لے کے چلے
نقصاں کے سوا کچھ نہ ہوا حاصل آہ   جاں لے کے یہاں آئے تھے تن لے کے چلے

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے   اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں   وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے   جاگو جاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
اٹھو اٹھو یہ خوابِ غفلت کب تک   دیکھو دیکھو اجل کمین گاہ میں ہے

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے   دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہونچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ   ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

جو شے ہے فنا اسے بقا سمجھا ہے   جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب   غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

اندیشے میں دن تمام ہو جاتا ہے   زنداں گھر وقتِ شام ہو جاتا ہے
زر داروں سے پوچھ حفظِ زر کی تکلیف   شب کا سونا حرام ہو جاتا ہے

خلق و تعظیم دولتِ دینی ہے   ہر عیب کا عیب، عیبِ خود بینی ہے
ہوتی ہے گنہگار کی توبہ بھی قبول   خالق کو پسند عجز و مسکینی ہے

مجموعی حیثیت سے میر انیس مرحوم کا کلام ایسے گرانقدر مضامین سے مالا مال ہے۔ جس کے مطالعہ سے ادبی ذوق کی سیری ہونے کے ساتھ ہمیں کافی نصیحتیں اور سبق ملتے ہیں۔ اور ہم اپنے اخلاق اوصاف، سیرت اور کردار کو بلند کرنے میں ان سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں وہ ہمارے لیے بڑی دولت چھوڑ گئے ہیں۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے۔ اگر ہم اس دولت سے فیضیاب ہونے کی طرف مائل نہ ہوں۔

دُعائے صحت

- موضع صاحب خاں ضلع کیمبل پور کے ساکن سید فدا حسین بخاری علیل ہیں کہ بحالیٔ صحت کے لیے قارئین کرام دُعا فرمائیں۔
- آغا سید منور حسین صاحب کربلائی گامے شاہ سادات لاہور ———— اور
- بیگم سید فرزند علی شاہ (ریٹائرڈ تحصیلدار ساکن وزیر آباد) کی صحت کے لیے قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلام

انیس کی مرقع نگاری

اگرچہ یہ شعر ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں ۔۔۔ شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

آتشؔ نے کہا تھا لیکن شاعری کی جو خصوصیات آتشؔ نے بیان کی ہیں وہ انیسؔ کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بے شک شاعری "مرصع سازی" ہے اور الفاظ کی بندش کرنا نگینوں کے جڑنے کے برابر ہے۔ اگر اس قول کے پیش نظر انیسؔ کا کلام دیکھا جائے تو اس میں الفاظ کا بہترین بندش اور مرقع نگاری پائی جائے گی۔

مرصع سازی جڑاؤ کام کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں آتشؔ کا مطلب شاعری میں خوش بیانی کے ذریعہ کلام کو آراستہ و پیراستہ کرنا ہے اور آراستگی کا حسن وہی پیدا کر سکتا ہے جو اُس فن کا ماہر ہو یعنی بہترین مرصع ساز ہی بہترین مرصع سازی کر سکتا ہے اور مرصع سازی ہے مناسب رنگوں اور سامانِ آراستگی کو مناسب جگہ دینا۔ یہ کام سخت مشکل ہے کیونکہ اگر اس فن کا ماہر رنگوں کی آمیزش وغیرہ نہیں جانتا تو اس کی اور اس کے فن کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوگی جو ایک اچھے اور باکمال فنکار کی ہونی چاہیئے۔ بالکل یہی حال شاعری کا ہے۔ شاعری میں موقع و محل کی مناسبت سے الفاظ کی کامیاب بندش کرنا بہترین مرقع نگاری ہے کیونکہ مرصع ساز جو کام رنگ و روغن اور دوسرے سامانِ آراستگی سے لیتا ہے شاعر وہی کام الفاظ سے لیتا ہے اور انہیں کی مدد سے اپنے فن میں رنگ بھر کر اُسے ابھارتا اور نکھارتا ہے ایک ماہر فن کار جانتا ہے کہ کہاں پر وہ شوخ رنگ اور کہاں پر ہلکے رنگ کے نگ وغیرہ لگائے کہ وہ چیز جو وہ بنانا چاہتا ہے خوب سے خوب تر ہو جائے اسی طرح شاعر الفاظ کی مدد سے اپنی تصویر میں رنگ بھر کر اسے موقع اور مناسبت سے ابھارتا اور نکھارتا ہے اس کے لئے اسے سخت محنت اور بالیدہ نظری کی ضرورت ہوتی ہے اگر اس کی نظر وسیع نہیں ہے تو وہ جو کچھ پیش کرنا چاہیگا اس میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر وہ اس فن کا ماہر ہے تو وہ اپنے مطلب کا لفظ کھنگال کر نکال لائے گا۔ اور چھانٹ کر وہی لفظ جس کی ضرورت ہے وہ چسپاں کر دے گا۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیئے تو میر انیسؔ کے یہاں الفاظ کی بہترین بندش ملے گی انہوں نے اپنی شاعری میں بہترین مرقع نگاری کی ہے یعنی انہوں نے اپنے کلام کو اپنی خوش بیانی سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے ایک شعر میں وہ فرماتے ہیں ؎

ہو جائیں گے یاقوت کے نگ کوئی گھڑی کو ۔۔۔ دانتوں سے نہ دابئے کوئی موتی کی لڑی کو

انیسؔ نے مرثیہ کو بنانے سنوارنے میں جو محنت شاقہ کی ہے اس کے لئے وہ خود کہتے ہیں ؎

مری قدر کر اے زمین سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا

اور یہ صرف شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے انہوں نے اردو مرثیہ کو بحیثیت صنف شاعری زندۂ جاوید بنا دیا۔ اُردو شاعری میں الفاظ و محاورات کا انمول خزانہ چھوڑ کر اسے دولتِ الفاظ و محاورات سے مالا مال کر دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو ان کے گھر کی زبان تھی۔ ان کا خاندان کا خاندان شاعر تھا بقول ان کے ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

جس کی پانچ پشتیں شبیرؑ کی مداحی میں گزری ہوں اس کے کمالِ شاعرانہ میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ خصوصاً مرثیہ نگاری کے فن میں تو وہ یکتا اور لاثانی و لافانی ہو گئے۔ اُن کی اس خوبی کو ان کے مخالفین و موافقین سب نے تسلیم کیا اور انیسؔ نے سب سے اپنی شاعری کا لوہا منوا کر داد و تحسین و آفرین بھی حاصل کی۔ اردو مرثیہ کی جو انہوں نے خدمت کی آج اس کا ہر شخص معترف ہے۔

میر انیسؔ نے مرثیہ میں نہ صرف اجزائے مراثی یا عناصر مرثیہ یعنی چہرہ، سراپا، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین اور دعا وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت باقاعدہ اشعار کہے بلکہ اردو شاعری میں بہترین رزمیہ شاعری کا مستقل عنصر داخل کر دیا مرثیہ میں اپنا ایک خاص ڈرامائی انداز پیدا کیا اور اس میں ڈرامے کی تمام خوبیاں اور خصوصیات پیدا کیں جس سے مرثیہ میں ڈرامے کا ایک خاص لطف پیدا ہو گیا اس طرح انیسؔ نے مرثیہ میں جامعیت، وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی۔

انیسؔ نے اپنے مرثیوں کے لئے الفاظ کے سمندر میں غوطہ لگا کر ایسا سیپ نکال کر لاتے ہیں جس کا موتی بیش بہا ہوتا ہے۔ اور اسے جہاں بھی رکھ دیا جاتا ہے اس کی آب و تاب شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے ان کو الفاظ کے انتخاب میں ایسی مہارت حاصل ہے کہ ان کے بعد کوئی مرثیہ گو ان کی بلندی کو نہیں چھو سکا۔

ان کے مرثیوں سے ایسے اشعار بہ آسانی تلاش کئے جا سکتے ہیں جس سے انیسؔ کی مرقع نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

انیسؔ کے یہاں بہترین منظر نگاری پائی جاتی ہے اور ان کی منظر نگاری کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ در حقیقت کوئی صاحبِ کمال ہے جس نے ایسی لاجواب منظر نگاری کی ہے مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھئے ؎

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
ہر نخل پہ ضیائے سرکوہ طور تھی گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

آفتاب کی گلاب سے، اور اوس کی موتیوں سے تشبیہ نئی تو نہیں ہے لیکن انیسؔ کے اندازِ بیان نے بے انتہا تازگی بخش دی ہے۔ دوسرا شعر تو اپنی بہترین تشبیہ کی وجہ سے زبان زد ہو گیا ہے اور "بارشِ بارانِ نور" کا انتخاب تو انیسؔ ہی کا حق تھا۔

وہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

یہ حسنِ تعلیل ہے اور انیس کا شہدائے کربلا سے جذباتی لگاؤ بھی۔

انہوں نے قدرتی مناظر کا نقشہ خوب کھینچا ہے اور وہ قدرتی مناظر کا اصل نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ دوران سفر حسینی قافلے نے ایک سرسبز و شاداب مقام کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا وہاں کی آرام دہ فضا کا منظر انیس کے الفاظ میں سے

کیا سبزۂ نوخیز ہے کیا خوب فضا ہے کیا چشمۂ شیریں ہے عجب سرد ہوا ہے
جنت کا نمونہ اسے کہئے تو بجا ہے آرام سے سونے کی اگر ہے تو یہ جا ہے
یوں غنچۂ خاطر متبسم ہوا کھل کر
خوش ہوتا ہے جیسے کوئی معشوق سے مل کر

نور

خوانِ نعمت کہیں ساغر تھا کہیں پانی کا شور تھا شاہ کے مہمان کی مہمانی کا

یہ تو تھے مناظر۔ اب ذرا انسانی جذبات کی عکاسی بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مسافرت اور پریشانی کے عالم میں کوئی شخص حضرتِ حسینؑ سے ان کا نام دریافت کرتا ہے تو وہ کس سادگی و انکساری کا مظاہرہ کرتے ہیں سے

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

اس سے حضرتِ حسینؑ کی مجبوری و بےچارگی اور انیس کی قدرتِ بیاں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

علی اکبرؑ جنگ کے لئے رخصت ہوتے ہیں تو ماں اور پھوپھیوں کا برا حال ہو رہا ہے سے

ماں خاک اڑاتی ہیں پھوپھی غش میں پڑی ہیں سب بیبیاں حلقہ کئے گرد ان کے کھڑی ہیں

ادھر میدانِ جنگ کا ہو بہو نقشہ اس طرح اتارا ہے سے

شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

یہ پُرشکوہ الفاظ قاری کو میدانِ جنگ میں پہنچا دیتے ہیں اور وہ ہیبت ناک منظر جو جنگ کا تھا سامنے آجاتا ہے۔

عونؑ و محمدؑ کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اسی لئے میدانِ جنگ میں بھی ان کی یہ کیفیت تھی سے

پھرتی تھی اجل ساتھ جدھر جاتے تھے دونوں پتّا بھی کھڑکتا تھا تو ڈر جاتے تھے دونوں
بیتے تھے سپر منہ پہ نہ ہٹ جاتے تھے دونوں تلواروں سے اُٹھ اُٹھ کے لپٹ جاتے تھے دونوں

ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی وہ خطرے کے وقت ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں سے

تلوار چمکتی تھی تو ہٹ جاتا تھا بھائی پھر دوڑ کے بھائی سے لپٹ جاتا تھا بھائی

جان کے خطرے اور بھائی کی محبت نے دونوں بھائیوں کو کیسی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ میدان کربلا میں گھمسان کا رن پڑا ہے دشمن سے لڑائی اس زور شور سے ہو رہی ہے کہ حسینی قافلہ کے لوگ جوشِ شجاعت میں دشمن کے چھکے چھڑائے دے رہے ہیں لیکن مخالف لوگ بھی کچھ کم طاقتور نہیں تھے اُن سے مقابلہ کرنا بڑی دلیری و جوانمردی کا کام تھا۔ لڑائی کے ساتھ ساتھ بھائی کا خیال رکھنا انتہائی مشکل کام ہے پھر بھی یہ لوگ ایک دوسرے کے لئے بے چین ہیں اور سوچتے ہیں کہ جنگ میں خدا معلوم کون بچا اور کون کام آگیا اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے انیس فرماتے ہیں ؎

جب شبیر سا ہو نچا وہ اُدھر یہ ادھر آیا   جان آگئی جب بھائی کو بھائی نظر آیا
بچ بچ کے نکلتے تھے جو تیروں کے تلے سے   اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

دشمن کی فوج بھی بڑی بہادر تھی اور اس کا یہ حال تھا ؎

عزّہ تھا اپنے زور پہ خانہ خراب کو   رستم کو مانتا تھا نہ افرا سیاب کو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسے بہادر اور جنگجو لوگوں سے قافلۂ حسینی برسرپیکار تھا یہ لوگ ظالم بھی تھے۔ اس لئے انیس نے یزید کی فوج کا ظلم دکھاتے ہوئے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بچوں پر بھی رحم نہ کیا اور جب حضرت حسینؑ اپنے بچے کی حفاظت کرنے میں ناکام ہوئے تو ؎

آنسو بھر آئے آنکھوں میں مُکھڑا جونہی ڈھلا   آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں مُنہ سے مُنہ ملا
جو حسرتیں تھیں دل میں قضا نے نکال دیں   ننھی سے باہیں باپ کی گردن میں ڈال دیں

باپ اور بیٹے کی محبت اور اس عالم مجبوری میں جو جذبات باپ اور بیٹے کے ہو سکتے ہیں اس کی سچی تصویر انیس نے پیش کر دی ہے۔ بیٹے کی شہادت کے بعد باپ کا فوراً جذبات میں بیٹے کے منہ سے منہ ملنا اور آنکھوں سے آنکھیں ملنا یوں ہی دل ہلا دینے والا منظر تھا کہ ننھے بچے کا شہادت کے بعد باپ کی گردن میں ننھی سی باہیں ڈال دینا پڑھنے والے پر گریہ طاری کر دینے کے لئے کافی ہے۔

انیس نے ایک جگہ " کھیت پڑنا " محاورہ بھی کتنا برمحل استعمال کیا ہے ؎

اس معرکے میں کھیت پڑے ہیں اسی طرح   بچے ہمارے تم سے لڑے ہیں اسی طرح

ایک بیٹی اپنے باپ کی لاش کو ہوئے بدن سے پہچان جاتی ہے کہ یہ اس کے بابا کی لاش ہے وہ بیتاب ہو کر کہتی ہے ؎

بے تاب ہے دل چھاتی پھٹی جاتی ہے اماں   اس لاش سے تو بابا کی بو آتی ہے اماں

بچوں کی جذبات نگاری میں تو انیس کا جواب ہی نہیں ہے۔ ان کی برجستگی دیکھئے ؎

چلائی سکینہ شہ والا کا سر آیا   دوڑو پھوپھی اماں مرے بابا کا سر آیا

چھوٹی بہن جو لاشے سے آکر لپٹ گئی　　اک حشر ہو گیا صفِ ماتم الٹ گئی

اُدھر پھوپھی کا یہ حال ہے ؎

مقتل کدھر ہے کوئی بتاتا نہیں مجھے　　اے نورِ عین کچھ نظر آتا نہیں مجھے

دوڑو ! کوئی معصوم گرفتارِ بلا ہیں　　بچوں کو چھڑا دے کہ یہ بے جرم و خطا ہیں

انیس بچوں کی نفسیات کے ایسے ماہر ہیں اور ان کی ایسی سچی تصویر پیش کرتے ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا مثلاً حضرت عباسؑ کی شہادت پر ان کے صاحبزادے بے قرار ہو کر لاش کی جانب دوڑ پڑے کیا دردناک منظر ہے ؎

دوڑا یہ سُن کے نہر کی جانب وہ بے پدر　　رو کے پکارے شاہ کہ بیٹا چلے کدھر

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نوحہ گر　　بابا کی لاش اٹھانے کو جاتے ہیں نہر پر

میّت نہ اُٹھ سکے گی تو خالی نہ آئیں گے

دامن میں ہم کٹے ہوئے ہاتھوں کو لائیں گے

اور صغرا کا یہ عالم ہے ؎

عرصہ ہوا آنکھوں کو نہیں کھولتی صغرا　　چپ ہو گئی ایسی کہ نہیں بولتی صغرا

انیس کی حقیقت نگاری بھی ملاحظہ فرمایئے کہتے ہیں ؎

فرزند جواں باپ کی قوت کا سبب ہے　　پیری کا عصا ہاتھ سے چھوٹا تو غضب ہے

سب اس جہاں میں آئے ہیں جانے کے واسطے　　پیدا ہوئے ہیں رنج اٹھانے کے واسطے

دکھلائے خدا داغ کسی کو نہ پسر کا　　یہ زخم کہاں، اور کہاں زخم جگر کا

شہدائے کربلا کا منظر انیس اس اہتمام سے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اب رُوح سوئے خلدِ بریں جاتی ہے آقا　　کچھ نیند بھی خادم کو چلی آتی ہے آقا

زانوئے شہِ دیں پہ سفر کر گئے عباسؑ　　گردن تو ڈھلی رہ گئی اور مر گئے عباسؑ

شہادت کے بعد مخدراتِ اہلِ بیت یوں بین کرتی ہیں ؎

مقتل سے رونے پیٹتے گھر میں حسینؑ آئے　　بیٹھی ہوئی تھیں بیبیاں ماتم کی صف بچھائے

باقی اگلے صفحہ پر

کسریٰ منہاس

سلامِ انیس

سلام بھی غزل ہی کی ایک صورت ہے۔ غزل کی کوئی اپنی مخصوص روایت ابتداء میں موجود نہ تھی۔ قصیدے اور مرثیے کے بین بین ایک اسلوب نکلا جسے غزل کہتے ہیں۔ یعنی اگر نشاطیہ رنگ حاوی ہو جائے تو غزل قصیدے سے جا ملے لیکن اگر المیہ رنگ شدت اختیار کر جائے تو غزل پر مرثیے کا اطلاق ہونے لگے۔ دنیا میں خوشی کم اور غم زیادہ ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حیات ہے۔ اس لحاظ سے اگر غزل میں ایسے مضامین کی کثرت پائی جائے تو مقامِ حیرت نہیں، قدماء نے غزل کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ مثلاً معاملاتِ حسن و

پہلے مصرعہ کے ساتھ

خوں میں بھرا ہوا علی اکبرؑ علَم جو لائے　　اِک غل ہوا کہ مر گئے عباسؑ ہائے ہائے
سر کھولنے کو زوجۂ عباسؑ ہٹ گئی
منہ پیٹ کر علَم سے سکینہؑ لپٹ گئی

اکبرؑ سے بچھڑنے کا کسی مادرؑ کو تھا غم　　کوئی غمِ اصغرؑ میں فغاں کرتی تھی پیہم
حیدرؑ کے نواسوں کا کوئی کرتی تھی ماتم　　قاسمؑ کو کوئی روتی تھی گردن کو کئے خم
کوئی غمِ عباسؑ میں مصروفِ بُکا تھی
. . . . ہائے حُسینا کی صدا تھی

ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ انیس کو الفاظ کے انتخاب اور ان کے برمحل استعمال پر کس قدر قدرت حاصل تھی اور اگر سید آغا اشہر لکھنوی کے الفاظ میں کہیں تو کہیں گے کہ،

"مناسبت الفاظ کو نازِ مرصع کاری کہتا ہے۔ اسی کو مقطع کاری۔ یہی سخن طرازی ہے۔ یہی دل آویزی خلاصہ یہ کہ یہی سب کچھ ہے"۔[1]

گویا کہ انیس نے مناسبتِ الفاظ سے اپنے کلام میں مرصع کاری، سخن طرازی اور دل آویزی پیدا کر کے اسے سب کچھ بنا دیا ہے۔ اور یہی ان کا کمالِ شاعرانہ ہے۔

---

[1] "حضرتِ رشید" از سید آغا اشہر لکھنوی صفحہ ۱

عشق کا بیان، یا درد انگیز آہ و فغاں کا تاثر۔ سلام کی شاعری کے بارے میں آخرالذکر تعریف زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ جب ہرن شکاری کتوں کے نرغے میں گھر جاتا ہے اور جائے فرار نہیں پاتا تو بے اختیار اس کے منہ سے دردانگیز چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔ ہرن یعنی غزال کی حزنیہ آوازوں کو غزل کہا جاتا ہے۔ اس تعریف کی ترازو میں سلام کی شاعری کو تولیے تب کہیں جا کر انیس و دبیر و مونس وغیرہم کے اسلوب کی قدر ہونا ممکن ہے۔ ورنہ ہم تنگ نظری کے ساتھ اگر غزل کو معاملاتِ حسن و عشق کے بیان تک محدود رکھیں تو سلام کو غزل کہنا ممکن نہ ہوگا۔

اصل میں غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے، جس میں معاملاتِ حسن و عشق کے علاوہ بھی بہت کچھ موجود ہے۔ اہلِ تحقیق اگر غزل پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ برصغیر پاک و ہند کے شعراء نے دنیا بھر کے مضامین غزل کے زیرِ عنوان پیش کئے حسن و عشق کا تو فقط نام ہے۔ اس لئے کہ بظاہر بات حسن و عشق کے رنگ میں کی جائے۔ لیکن استعارے اور تشبیہہ کے پردوں سے جھانک کر دیکھئے تو مقصودِ سخن کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ شاعر کا پیغام جو کچھ بھی ہو جب غزل میں ظاہر کیا جائے تو حسن و عشق کے پردے میں ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بات اتنی محدود نہیں کہ جو کچھ ہم نے حسن و عشق کے بارے میں کہا ہے اسے قطعی خیال کیا جائے۔ اردو شاعری کی ابتداء سے غزل میں ایسے مضامین ادا کئے جاتے رہے جن کا تعلق حسن و عشق کی روایت سے کسی طرح بھی نہیں ہے۔ مثلاً خوفِ مرگ، نیک اور پاک زندگی بسر کرنے کی تلقین، قناعت و صداقت کی تبلیغ و اشاعت، زمانے کی بے ڈھنگی چال پر طنز۔ جب زمانہ اور آگے بڑھا اور اردو شاعری نے مزید ترقی کی تو مخصوص روحانی اور مذہبی خیالات بھی غزل میں داخل ہو گئے۔ تاریخی اعتبار سے یہ زمانہ وہ تھا جب فضا قصیدے کے لئے سازگار نہیں رہی تھی۔ سادہ شاعری عظمتِ گزشتہ کا مرثیہ بن کر رہ گئی تھی۔ دلی کی اسلامی سلطنت آخری سانس لے رہی تھی اور اودھ کی حکومت ختم ہوا چاہتی تھی۔ ایسے دور میں لکھنؤ میں مرثیے کی شاعری پر شباب آیا۔ مصائبِ اہلبیتؑ انسانیت کے لئے وجہ تسکین بھی ہیں۔ ایک پہلو ان مصائب کا خالص اسلامی ضرور ہے۔ لیکن دوسرا پہلو ہر مذہب اور ملت کے لئے پیغام سکون ہے۔ مرثیے کی شاعری جہاں مسلمانوں میں مقبول تھی۔ وہاں غیر مسلموں میں بھی اس کی مقبولیت کچھ کم نہ تھی۔ وہ دور ہی ایسا تھا۔ مصائب کا تذکرہ آخر کار مرثیے تک محدود نہ رہا۔ اس نے رباعی اور غزل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ مجالسِ عزا میں برسرِ منبر رباعیاں اور سلام پڑھنا ایک دستور بن گیا۔ جو آج تک جاری ہے ایسی فضا میں جو غزل پڑھی جائے آسانی کی خاطر ہم اس کو سلام کا نام دیتے ہیں۔

سلام کو ایک نکھرے ستھرے رنگ کی غزل قرار دینا چاہیئے۔ یعنی ایسی غزل جو تغزل سے جدا ہو اور عشقِ مجازی کی آلودگی سے پاک ہو۔ جس میں اہلبیتِ پاک پر سلام بھیجا جائے۔ سلام کے مخاطب امامؑ اور رفقائے امامؑ ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلام کے ذریعے محبت کا جو پیغام دیا جائے گا وہ کس قدر بلند ہوگا۔ یعنی خدا، پیغمبرِ خدا اور آلِ پیغمبر اور ان کے رفقاء ہمارے محبوبِ نظر ہوں تو ہماری غزل سلام بن جاتی ہے۔ سیرت و صورت کے وہ شاہکار جن پر خالق کو فخر و ناز ہے۔

سلام کی شاعری کے محبوب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جس قسم کی فضا سلام کے لئے پائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق مرثیے سے ہے۔ لہٰذا المیہ مضامین سلام کی شاعری میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ تاریخی طور پر اس کی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ سلام کو مرثیے کا پیش لفظ یا تتمہ کہا جا سکتا ہے ادبی لحاظ سے سلام ایک علیحدہ صنفِ سخن بھی ہے۔ مرثیے سے اس کا اشتراک ان معنوں میں ہے کہ انیس و دبیر جیسے باکمال مرثیہ نگاروں ہی کے ہاتھوں سلام کی شاعری پروان چڑھی۔ اشتراکِ مضامین سلام اور مرثیے میں موجود ہیں۔ لیکن جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے سلام مرثیے سے مختلف ہے۔ اور غزل سے مماثلت رکھتا ہے اس سے قطع نظر جہاں تک بات لب و لہجہ کی ہے۔ سلام مرثیے سے قریب تر اور تغزل کی شاعری سے مختلف ہے۔ اس طرح سلام ایک الگ صنفِ سخن بن جاتا ہے۔ بعض چیزوں میں یہ غزل سے مختلف اور مرثیے سے ملتا ہوا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں مرثیے سے مختلف غزل سے مماثلت رکھتا ہے۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے۔ سلام مرثیے کی شاعری پر ایک اضافہ ہے۔ جب ہم اساتذہ کے سلاموں کا جائزہ لیتے ہیں تو بقول انیس ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

یعنی مختلف النوع مضامین کا ایک باغ ہے جسے ہم سلام کہتے ہیں۔ واقعاتِ کربلا سے سلام کا گہرا ربط ہونا ایک امرِ طبعی ہے اس کے باوجود نئے نئے موضوعات بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اساتذہ نے سلام میں سموئے ہیں۔ سلام کی شاعری کا ایک جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ نصف سے زائد اشعار واقعاتِ کربلا سے متعلق ہیں اور نصف سے کچھ کم براہِ راست واقعاتِ کربلا سے متعلق نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں نفسیاتی اعتبار سے وہی روح کارفرما ہے۔ جو مرثیے کی شاعری میں پائی جاتی ہے یعنی نشاطیہ اور مجازی رنگ سلام کی شاعری کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ اخلاقی مضامین اور خصوصیت کے ساتھ غم انگیز موضوعات سلام کی شاعری کی جان ہیں۔ دو مصرعوں میں پورا مضمون سمو دینا اور پھر وہ مضمون بھی ایک بلند اخلاقی اقدار سے معمور مضمون ہو تو ایک بڑے کمال کی بات ہے۔ لیکن جن باکمالوں نے سلام کی شاعری کو پروان چڑھایا ان کا بھی مشرقی شاعری میں جواب نہیں ہماری مراد میر انیس اور مرزا دبیر سے ہے۔ انیس کے بارے میں تو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ سلام کی شاعری انیس سے شروع ہوئی[1] لیکن اس دعوے کی صداقت پر اصرار نہیں۔ مگر کہا جاتا رہا ہے کہ سلام کی شاعری ایجادِ انیس ہے۔ ایک بلند مرتبہ مرثیہ گو کے لئے مشاعرہ بازی دون مرتبت تھی دوسری جانب وہ زمانہ مشاعرہ بازی کا تھا۔ انیس نے یہ کمال کر دکھایا کہ غزل کی ہیئت میں مرثیے کے مضامین اور ان کے علاوہ اخلاقی مضامین نظم کر کے اس کو سلام کا نام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ میر خلیق کا فیضان تھا۔ انہوں نے انیس کو نصیحت کی تھی کہ پست اور مبتذل غزل گوئی سے محترز رہ کر مدحتِ اہلِ بیتؑ کو اپنا شیوہ بنانا چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے مرثیہ گوئی کے علاوہ رباعی اور سلام کے اصناف کو بھی بلند ترین مقام پر پہنچایا۔

انیس کے سلاموں میں کہیں کہیں شاعرانہ تعلی کا رنگ بھی ملتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے انیس کے سلاموں کا جائزہ لیا جائے تو کثیر تعداد میں ایسے اشعار سامنے آجاتے ہیں۔ جن میں انیس اپنے حریفوں کو للکار رہے ہیں کہیں رنگ تو خاص میرا رنگ ہے۔ میرے

---

[1] میر خلیق، میر حسن بلکہ ان شعراء سے بھی پہلے سلام لکھے گئے جو موجود ہیں (مدیر)

ہی مضامین کو ردو بدل کے ساتھ ایک نیا چولا پہنا کر میرے ہی مقابلے میں پیش کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ انیس کو اگر یہ شکوہ تھا تو کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ خاص کر اس صورت میں کہ ہم سلام کی شاعری کو انیس کا ایجاد قرار دیں۔ اس سے قبل یہ صورت تھی کہ مرثیہ نگاری کے وسیع تر میدان میں چند موضوعات پر انیس اور ان کے حریفوں میں چشمک رہا کرتی تھی۔ انیس کا دعویٰ تھا کہ ان کا کلام تھا

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

کے مصداق مرثیہ گوئی میں منفرد مقام رکھتا تھا۔ اور نئے سے نئے مضامین جن سے مرثیہ گوئی کی شان دوبالا ہوئی۔ خاص خاندان انیس کا ایجاد ہیں۔ اس کے برخلاف انیس کے ہم چشم دعویٰ کرتے تھے کہ تمام نئی اختراعات، مرثیہ گوئی میں حریفان انیس کی تخلیق ہیں۔ ان مباحث پر خاموشی ہی بہتر۔ ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے سامنے جو موضوع ہے وہ مرثیہ نہیں سلام ہے اور جہاں تک سلام کا تعلق ہے سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سلام کو عام طور پر انیس کی ایجاد تسلیم کیا جاتا ہے؎ لہٰذا شاعرانہ تعلّی کے انداز میں جب انیس اپنی برتری کا اعلان کرتے ہیں تو وہ حق بجانب نظر آتے ہیں ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

تمہاری نواسنجیوں نے انیسؔ
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

بہتا ہے انیسؔ خونِ انصاف
مضموں مرے قتل ہو رہے ہیں

بحرِ جہاں میں قطروں نے بھی سر اٹھائے ہیں
دیکھیں کہ ان حبابوں میں کب تک ہوا رہے

اللہ کیا نمک ہے کلامِ انیس میں
دشمن بھی گر پڑھے تو زباں پر مزا رہے

دمِ تحریر گل ریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پر
صریرِ کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے

صبا لے کے جا میرے پھولوں کی بو
دماغِ عدو بھی معطر رہے

کس طرح قدر تجھے اپنے سخن کی ہو انیسؔ
مرتبہ مشک کا آہوئے ختن کیا جانے

مرا زورِ دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارہ نہیں

وہ گُل ہوں جدا سب سے ہے جس کا رنگ
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیر ابرا نہیں جس میں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

کمالاتِ انیسؔ کا احاطہ کرنا محال ہے۔ اصل عظمت تو ان کے مراثی ہی کو حاصل ہے۔ ضمنی طور پر رباعیات اور سلام بھی

؎ میر انیس کے اجداد بھی سلام لکھتے رہے ہیں۔ (مدیر)

نیر سے کم نہیں سے
ذرہ ہے اکسیر خاکِ کربلا کے سامنے
زر و مٹی کی حقیقت کیا طلا کے سامنے

کہاں بیڑیاں اور کہاں پائے عابد
یہ نشتر کہیں ناتواں کھینچتے ہیں
پسینہ نہیں پونچھتے رخ سے حضرت
گلابِ گلِ ارغواں کھینچتے ہیں
پکاری سکینہؑ طمانچے ہے بابا!
ستمگر مری بالیاں کھینچتے ہیں
کہا رو کے اکبرؑ نے اے دردِ تم جا
کلیجے سے بابا سناں کھینچتے ہیں

مقتل سے شہر شہر گئے طائرانِ دشت
سبطِ نبیؐ کے خوں میں بھرے پر جدا جدا
رسّی سے یوں بندھے تھے اسیرانِ اہلبیتؑ
ہوں جیسے ایک رشتے میں گوہر جدا جدا

مجرئی جس نے مزارِ شہِ ذیشان دیکھا
اس نے دنیا ہی میں بس روضۂ رضواں دیکھا
رکھ کے زانو پہ سرِ حرؑ کو کہا حضرت نے
اپنے رتبے کو بھی کچھ اے مرے مہماں دیکھا

شہیدِ ظلم ہیں دونوں نبیؐ کے لختِ جگر
غمِ حسینؑ نہیں ماتمِ حسنؑ سے جدا

وطن میں پھر کے سفر سے نہ آسکے تھے جی
عجب گھڑی تھی کہ سرور ہوئے وطن سے جدا

لحد میں دیکھیو داغِ غمِ حسینؑ کی ضو
زوال جس کو نہیں ہے وہ آفتاب یہ ہے
یزید تخت کے اوپر ہو، اور نکلے سرِ شاہؑ
انیسؔ دیکھو زمانے کا انقلاب یہ ہے

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا
اگر بہشت میں ہوتے نہ کوثر و تسنیم
تو رونے والوں کی آنکھوں کا پھر جواب نہ تھا

دیکھ ہمشکلِ پیغمبرؐ کو یہ کہتے تھے عدو
اس کے چہرے سے عیاں نورِ خدا ہوتا ہے
حوصلہ تھا یہ حسینؑ ابنِ علیؑ کا ورنہ
سجدہ خنجر کے تلے کس سے ادا ہوتا ہے

غمِ حسینؑ کے داغوں سے دل کرو روشن
خبر لحد کے اندھیرے کی کیا نہیں رکھتے
خدا نے آیۂ تطہیر جن کو بھیجا تھا
وہ پردہ دار سروں پہ ردا نہیں رکھتے

یارب! ہو پیچ میں لحد ذاکرِ حسینؑ
ہو اس طرف نجف تو ادھر کربلا رہے

مشتے نمونہ از خروارے انیسؔ کے سلاموں میں مضامین جو مرثیوں اور سلاموں کے درمیان مشترک ہیں چیدہ چیدہ پیش کئے گئے ہیں۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ان سے بہتر اشعار انیسؔ کے سلاموں میں موجود نہیں۔ یہ محض ایک سرسری انتخاب ہے مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ مجلسِ عزا میں مرثیے کے ساتھ ساتھ سلام پڑھنے کا جو رواج چلا آتا ہے اس کی بنیاد کس قسم کے موضوعات پر ہے۔ یہ مضامین صریحاً مضامینِ مراثی سے مشتق نظر آتے ہیں۔ پھر بھی انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ دو مصرعوں میں بڑے بڑے نازک، دقیق اور بلند مضامین انتہائی خوبی سے نظم کر دیتے ہیں۔ بعض اشعار ضرب المثل ہو کر رہ گئے ہیں۔ جن کا بھلانا ممکن نہیں۔

انیسؔ کے سلاموں میں یہی رنگ نہیں ایک اور رنگ بھی ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے ایک ایسا رنگ جو سراسر مرثیے کی فضا میں ڈوبا ہوا ہو پھر بھی مضامینِ مرثیہ سے اپنا وجود الگ رکھتا ہو اور بھی زیادہ قابلِ داد ہے۔ اس رنگ میں ایک خوبی یہ ہے۔ یہ رنگ اتنی گنجائش رکھتا ہے کہ ہر قوم و ملت کے لئے اس کی اپیل برابر ہے یہ خالص شاعری ہے ؎

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

انیسؔ عمر بسر کر دو خاک ساری میں
کہے نہ کوئی غلامِ ابوترابؑ نہ تھا

اک افسانۂ بے کسی رہ گیا
نہ قاتل رہا اور نہ سرور رہے

فقیروں کی کیا موت کیا زندگی
جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

بدن گھل گیا مثلِ تیغِ اصیل
نہ کس بل رہا اور نہ جوہر رہے

وہ ہے آدمی جس سے ہو کارِ خیر
بشر وہ جو دنیا میں بے شر رہے

نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیسؔ
فقیری میں بھی دل تونگر رہے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

قبر میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست
میں سُنے گھر میں اکیلا رہ گیا

سوؤ گے کب تک میں اب اٹھو انیسؔ
دن بہت غفلت میں تھوڑا رہ گیا

ساتھ جانا نہیں کچھ جز عمل انیسؔ
اس پہ انساں کو ہے خواہشِ دنیا کیا کیا

کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر
جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہوا

کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں
صدف کی طرح بہتر جو آب روانہ ہوا

بھٹک کے راہ سے پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ
اٹھو انیسؔ اٹھو کارواں روانہ ہوا

ہے۔ جو نہ صرف اُردو کی روح رواں ہے۔ بلکہ اس نے انیس کو ان کے اصلی رنگ روپ میں ملک میں روشناس کرایا ہے۔ لیکن آج جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس پر بہت کم تبصرہ نگاروں نے اس نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے۔

شاعری کو سمجھنے کے لئے ہمارے تنقید نگاروں نے چند مسلمات مقرر کئے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعر کا ماہر نفسیات ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس صفت سے مُعرا ہے۔ تو انسانی جذبات و کیفیات کو سمجھنا، انہیں صحیح طور پر پرکھنا اس کے لئے امر دشوار ہے۔

نفسیات کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میدان میں اکثر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ نفسیاتِ انسانی پر کسی قدر روشنی بھی ڈالی ہے۔ لیکن کامیابی جو انیس نے حاصل کی ہے وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔ انیس میں یہ صفت نہ صرف یہ کہ بدرجۂ اتم موجود ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ اس میدان کا بادشاہ تھا، وارداتِ انسانی کا کامیاب مصوّر تھا، وہ نباضِ فطرت تھا تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ اس نے زندگی کو قریب سے دیکھا، زندگی اور اس کی باریکیوں کو سمجھا، جذباتِ انسانی کو پڑھا۔ دل کی گہرائیوں میں اتر اور دل کی تڑپ کو پہچانا، ذہنی اڑان کو پہنچا، پستی کی گہرائی تک رسائی حاصل کی، احساساتِ انسانی کی صحیح رنگ آمیزی اور اس پر تبصرہ کیا۔ یہ حقیقت میں اتنا لطیف اور عمیق تبصرہ ہے کہ اس میں شاعری سے علیحدہ مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔

واقعۂ کربلا کی مختلف شخصیتوں کی ذہنی کشمکشوں کا جائزہ لینا۔ ان کے احساساتِ قلب سے پردہ اٹھانا، ان کی خوشی کو ہماری خوشی اور ان کے رنج کو ہمارا ذاتی غم بنا دینا انیس کا وہ زبردست کارنامہ ہے۔ جس کی داد صرف ایک ماہرِ نفسیات ہی دے سکتا ہے انیس کی وہ صفت جس میں آج زمانے کا کوئی شاعر اس کا حریف نہیں وہ ہے جذبات کے مختلف مدارج کو ملحوظ رکھنا۔ جن حالات میں جس شخص میں اس کی عمر و سال کے لحاظ سے، اس کے رشتہ کے لحاظ سے جو جذبات پیدا ہونے چاہئیں اور جس حد تک پیدا ہونے چاہئیں انیس نے انہیں جذبات کو اس شخص میں اس کی عمر و سال کے لحاظ سے اس کے رشتے کو ملحوظ رکھ کر اسی حد تک دکھائے ہیں ایسے تو نفسیات کو سمجھنا ایک دشوار گذار امر ہے۔ لیکن بچے کی صحیح صحیح نفسیات سے واقف ہونا شاید سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایک موقع پر حسنین علیہم السلام کی کم سنی کا ایک واقعہ نظم کرتے ہیں۔ رسولؐ مسجد میں تشریف فرما ہیں بچے کھیلتے ہوئے نانا کے پاس آتے ہیں۔ ناناؐ فرطِ محبت سے گلوئے حسینؑ اور دہنِ حسنؑ کے بوسے لے رہے ہیں۔

لیکن:-

شبّیر چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب ۔۔۔ پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب ۔۔۔ جھک جھک کے چومتے تھے گلا سیدِ عرب
بھائی کو دیکھ کر جو حسنؑ مسکراتے تھے
غیرت سے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے

اب غیور بچّے کے تیور ملاحظہ فرمایئے نانا کے لبوں پر بوسہ نہ دینے سے حسینؑ کے دل پر چوٹ لگی خفا ہو گئے ہیں حسینؑ

لیکن اِس خفگی کا عالم کیا ہے :-

اٹھے حسینؑ زانوئے احمدؐ سے خشمگیں ۔۔۔ غصے سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
رُخ پہ پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں ۔۔۔ پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

بچہ کا ماں سے خفگی کا اظہار کس انداز میں ہے :-

تم اماں جان منہ کو تو سونگھو مرے ذرا ۔۔۔ کچھ بوئے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا؟
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں
اب ہم نہ جائیں گے ہمیں نانا رلاتے ہیں

پانچ چھ برس کے بچے کا یوں خفگی کے عالم میں آنکھوں پہ آستین دھر لینا۔ پوچھنے پر بھی کوئی جواب نہ دینا اور سر جھکائے ہوئے چلے جانا عین بچے کی فطرت کے مطابق ہے۔ بچے کی خفگی اس کی رقت وزاری کا ماں کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کی خفگی کا راز وہ کس طرح دریافت کرنا چاہتی ہے لیکن اس کا انداز کیا ہوتا ہے اور کیا ہونا چاہیئے ۔ فاطمہؑ نے حسینؑ کو حزں دیکھا ہے۔ بے چین ہوگئی ہیں۔ فرماتی ہیں :-

ہے ہے حسینؑ کیا ہوا کیوں ہے اشکبار
. . . .
تجھ کو رلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا ۔۔۔ قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا
گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
سمجھی میں کچھ حسنؑ سے خفا ہو کے آئے ہو

کہتی ہیں :-

تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں ۔۔۔ گذری ہیں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رلائیں
ان سے نہ بولیو وہ تمہیں لاکھ گر منائیں
لو آؤ جاتے دو تمہیں چھاتی سے ہم لگائیں
واری اگر حسنؑ نے رلایا برا کیا ۔۔۔ پوچھوں گی کیا نہیں مرے بچے نے کیا کیا

ان اشعار میں ماں کے منہ سے یہ الفاظ ادا کرنا کر "گذری ہیں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رلائیں" یا ماں کا اپنی چھاتی سے بچے کو لگا لینا یہ تمام باتیں اور یہ تمام جذبات سوائے ایک ماں کے اور کسی کے نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح انیس نے اپنے مراثی میں دوسرے مواقع پر بھی نفسیاتی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ جناب زینبؑ اور ان کے بچوں کا مکالمہ ایک نفسیاتی چیز ہے۔ اس واقعہ کی کوئی تاریخی شہادت بھی موجود نہیں کہ اس سانحہ جانگداز سے کوئی ایسا واقعہ بھی جس کا ذکر انیس نے ذیل کے اشعار میں کیا ہے وابستہ تھا۔ واقعہ یہ نظم کیا ہے کہ جناب مسلمؑ کے بچے شہید ہو چکے ہیں۔ جناب زینبؑ اپنے بھائی سے شرمندہ ہیں ان کو اپنے بچوں پر غصہ آ رہا ہے کہ مسلمؑ کے بچوں سے پہلے انہوں نے اپنی جان ماموں پر کیوں نہیں قربان کی۔ ماں کی خفگی کو انیس اس طرح دکھاتے ہیں :-

جناب زینبؑ فرماتی ہیں :-

ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجھکو
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجھکو

آتا ہے دمِ صبح سے یاں لاشہ پہ لاشا — ان کے لئے اوروں کی لڑائی ہے تماشا
رخصت نہیں ملتی یہ سخن خوب تراشا — باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا

اس خفگی میں ایک اور لطیف طنز ملاحظہ کیجئے :-

عباسؑ علیؑ خوں میں نہالیں تو یہ جائیں
ہم شکل نبیؐ برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں
لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں

یا :-

میں پہلے ہی سمجھی تھی کہ ڈھونڈیں گے بہانا — کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا

ماں کے غم و غصہ کی حالت میں بچوں کا سامنے آجانا اس بات کا متقاضی ہے کہ غصہ میں اور شدت پیدا ہو جائے جناب زینبؑ کے بچے گھر میں تشریف لائے ہیں۔ ماں کا بچوں پر نظر ڈالنے کے بعد عجیب عالم ہو گیا ہے۔ جو قطعی طور سے نفسیاتی ہے۔ فرماتی ہیں :-

ماں کو تو سبک کر چلے کنبہ کی نظر میں — میں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں — کھولیں اسے باندھے ہیں جو ہتھیار کمر میں
نوجواں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے؟
لو ناز ہے اس پر کہ نواسے ہیں علیؑ کے

بچوں کا جواب ملاحظہ کیجئے :-

تھرا کے وہ بولے کہ ہماری نہیں تقصیر — قسمت میں خجالت تھی نہ یاور ہوئی تقدیر

فرمایا شجاعت کے منافی ہے یہ تقریر   مسلمؑ کے پسر کا ہے کہ تھے صاحبِ شمشیر
جاتے ہوئے کسی دوست کو آقا نے نہ روکا
روکا نہیں، اُن کو شہ والا نے نہ روکا
جوبات پہ مرتے ہیں وہ مرجاتے ہیں پیارو   آزردہ تھی پر خیر خوشی ہوں کہ سدھارو

ایک دلیر اور شجاع ماں کو جس طرح اپنے بچوں کا حوصلہ بڑھانا چاہیئے۔ اسی انداز سے بچوں کے حوصلے بڑھاتی ہیں :۔

اعدا کو مرے خون کی تاثیر دکھانا   اجلالِ حسنؑ شوکتِ شبیرؑ دکھانا
تن تن کے یداللہؑ کی تصویر دکھانا
خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو   بچے اسداللہؑ کے ہو جان پہ کھیلو
تیغوں میں دھنسو برچھیوں کو سینے سے ریلو   کوفہ کو تہِ تیغ کرو شام کو لے لو

اور - - -

کسریٰ کا رہے تخت نہ خاقاں کا رہے تاج   ہاں غازیو! چین و حبش و زنگ سے لو باج
چڑھتا ہے لڑائی پہ جوانمردوں کی معراج   گیتی تہہ و بالا ہو وہ تلوار چلے آج
مَیلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں ! ! ! ! !
جس کے ہیں بس اس کے ہیں جدھر ہیں بس ادھر ہیں

ان اشعار میں ایک ماں کے نہ صرف غم و غصہ کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ بلکہ اس کے تاثراتِ قلبی کی اس کے نازک سے نازک تر خیالات و جذبات کی اس لطیف سے لطیف تر کیفیت قلبی کی اس طرح کامل ترجمانی کی ہے کہ سامع اسے فطرتِ انسانی کے عین مطابق سمجھنے پر مجبور ہو جائے اور یہ صرف ماہر نفسیات ہی کا کمال ہو سکتا ہے۔ کسی دوسرے کا نہیں۔

اکثر اوقات کئی طرح کے جذبات مخلوط ہونے سے ایک خاص کیفیت انسان کے دل پر طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کے دل میں دو طرح کے خیالات و جذبات یکے بعد دیگرے کچھ دیر تک برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح نہ معلوم کتنی عجیب عجیب کیفیتیں انسان کے دل پر گذرتی رہتی ہیں۔ انیس ایسے موقعوں پہ جذبات کی فطری حالت کو محسوس کر لیتے ہیں۔ اور اس کے اظہار کے لئے طرح طرح کے مؤثر پیرائے اختیار کرتے ہیں۔

ایک موقع پر یہ واقعہ نظم کیا ہے کہ حسینؑ اپنی پیاری بیٹی فاطمہ صغراؑ کو بوجہ شدتِ مرض مدینہ میں چھوڑ رہے ہیں کوئی عزیز بیمار کی سفارش نہیں کرتا۔ اس وقت بیمار کی کشمکش ذہنی و کیفیتِ قلبی کیا ہے۔ اور کیا ہونی چاہیئے۔ اس کا نقشہ انیس نے ایسے الفاظ میں کھینچا ہے۔ جس کی ستائش و داد مشکل نہیں بلکہ کسی حد تک ناممکن ہے۔ حالتِ تپ میں جناب صغراؑ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے :۔

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

حالتِ مایوسی میں شکایت کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ بہن کو بھائی سے شکایت پیدا ہو گئی۔ فرماتی ہیں :۔

عاشق مرے مشہور ہیں بھیا کے میں واری
دو دن سے خبر بھی نہیں لی آ کے ہماری
میں کون سکینہؑ ہے چچا جان کی پیاری

بیماری میں یہ احساس پیدا ہو جاتا جو کہ آخری مصرع سے ظاہر ہوتا ہے یعنی

"میں کون سکینہؑ ہے چچا جان کی پیاری"

بہت ہی گہرا اور عمیق نفسیاتی تجزیہ ہے۔

یوں تو ہزاروں تذکرہ نویسوں نے داستانیں لکھی ہیں۔ شاعروں نے شاعری کی ہے۔ لیکن بھائی اور بہن کی محبت میں کیا لطیف و نازک فرق ہے اسے صرف انیسؔ ہی سمجھا ہے اور سمجھا سکا ہے۔ حالتِ تپ میں بہن کو بھائی سے خیریت نہ دریافت کرنے پر شکایت ہے۔ شکایت کا لازمی نتیجہ بسا اوقات روٹھ جانا بھی ہوتا ہے۔ بہن بھی بھائی سے روٹھ گئی ہے۔ لیکن بھائی منا رہا ہے :۔

کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغراؑ ! مری تقصیر ؟

بھائی کے محبت بھرے جملے کا بہن کے دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کے دھڑکتے اور نازک دل پر کیا کیفیت گذر جاتی ہے۔ وہ اس پر سے اپنا آپ قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ بھائی کے پیار بھرے جملے سن کر بہن کے منہ سے بے ساختہ کیا الفاظ پھوٹ نکلتے ہیں۔ وہ سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ فرماتی ہیں جنابِ صغراؑ

صدقے ترے سر پر سے اتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

دوسری جانب چھوٹے بھائی سے یہ کلام ہے کہ " وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری "

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغرؑ مری آواز کو پہچان گئے تم
تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تپ ہے تمہیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی

ان اشعار میں بہن بھائی کی محبت کے نازک فرق کو ہمارے سامنے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایک غور طلب امر

جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے، جسے سننے کے بعد ہم کچھ کھو سے جاتے ہیں۔ وہ ہیں بیمار کے یہ الفاظ " اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم " دوسری جانب شدتِ تپ سے چھاتی سے نہ لپٹانا، یہ ایک ایسا نفسیاتی تجزیہ ہے جس کی نظیر اور شاعری میں ملنی ممکن نہیں۔ بقول نظم طباطبائی " انیس کے ان اشعار میں شاعری نہیں بلکہ سحر ہے۔

ایک دوسرے موقع پر انیس نے بھائی سے بھائی کی محبت دکھائی ہے۔ مصرع سنئے :-

" جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا "

دیکھنے میں تو یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ مقام جہاں پر یہ بات اُن کی زبان سے نکلی ہے۔ وہ قابلِ غور ہے۔ کتنے معنی ہیں جو اس مصرع میں پوشیدہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہجوم فوج میں بھائیوں کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ دونوں شہید ہونے کی آرزو میں آئے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھا کر شہید ہو گیا کہ یکا یک :-

جب شبّر سا پہنچا یہ اُدھر وہ اِدھر آیا
جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

دوسرے موقع پر بھائیوں کی انتہائی خوشی کا نقشہ کھینچا ہے۔ جناب مسلم کے دونوں شہزادے قید خانے سے چھوٹے ہیں اور اس وقت ان کی قلبی کیفیت کیا ہے :-

" اِک بھائی ہنسا ایک کے آنسو نکل آئے "

اس مصرع میں غور طلب بات یہ ہے کہ انسان کے ہمیشہ دو ہی حالتوں میں آنسو نکلتے ہیں۔ زیادہ غم میں یا زیادہ خوشی میں۔ انیس نے اسی نفسیاتی چیز کو اس مصرع میں سمویا ہے۔ انیس نے اکثر مواقع پر ایک ہی انسان کے مختلف جذبات دکھائے ہیں۔ جگہ جگہ حالات میں کچھ ایسا ضمنی تغیر پیدا کر دیا ہے۔ کہ جذبات فطرت کے مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ ایک جانب اگر پھوپھی بھتیجے کی محبت کا نقشہ کھینچا ہے تو دوسری طرف اسی محبت میں شکایت کا عنصر بھی نہایت لطیف انداز میں سمویا ہے۔ پھوپھی بھتیجے پر اپنے بچوں کو نثار کر چکی ہے۔ لیکن بھتیجے نے رن میں جانے وقت پھوپھی سے اذنِ جنگ نہیں لیا۔ پھوپھی اضطراب کے عالم میں ہے۔ شکایت دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسی شکایت جیسی ارمان بھری پھوپھی کو بھتیجے سے ہوتی ہے۔ فرماتی ہیں :-

باقی نہ محمد ہے نہ اب عون ہے بیٹا
تم ہی جو نہ پوچھو تو مرا کون ہے بیٹا

اس شعر میں انیس نے نہ صرف جذباتِ انسانی کی ترجمانی، اس کے احساساتِ قلب کی عکاسی کی ہے۔ بلکہ نظم طباطبائی کے الفاظ میں " نفسیاتِ انسانی کو سمو دیا ہے۔ جس سے اس کے گہرے اور عمیق نفسیاتی تجزیہ کا ترشح ہوتا ہے۔"

المختصر انیس کی شاعری لفظی نقاشی نہیں۔ ایسا آئینہ رونما نہیں جس میں صرف اپنا ہی چہرہ نظر آئے بلکہ وہ جامِ جہاں نما

(باقی اگلے صفحے پر)

ڈاکٹر اسلم فرخی
(کراچی یونیورسٹی)

میر انیس کی رزمیہ کیفیات

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے گر بزم
خیبر کی خبر لائے میری طبعِ اولوالعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ جو ہو بالجزم
دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

مصرعے ہوں صف آرا صفت لشکرِ جرار
الفاظ کی تیزی کو نہ پہنچے کوئی تلوار
نقطے ہوں جو ڈھالیں تو الف خنجرِ خونخوار
مد آگے بڑھیں برچھیوں کو تول کے اکبار
غل ہو کبھی یوں فوج کو لڑتے نہیں دیکھا
مقتل میں رن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا

میر انیس نے ان اشعار میں کسی شاعرانہ تعلّی سے کام نہیں لیا بلکہ انہوں نے حقیقت پسندانہ انداز میں اردو مرثیے

پچھلے صفحہ سے آگے

اور آئینہ سکندری ہے۔ جس کی وسعت تمام دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ جس میں انسانی دکھ درد، رنج و غم، خوشی و شادمانی کے صاف صاف نقشے نظر آتے ہیں۔ اس کے یہاں نقشِ انسانی کے نقشے حیاتِ انسانی کے تذکرے اور اس کی حقیقتیں موجود ہیں۔ زندگی کے تڑپتے ہوئے جلوے ہیں۔ حقائقِ انسانی کے صحیح نقشے ہیں۔ ذہنی کشمکشوں کا جائزہ ہے زندگی کے تقاضے اور اس کے مقاصد کی مصوری ہے۔

وہ حقیقی معنوں میں ماہر نفسیات ہے اس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ انسان کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کیا ہے۔ زندگی کے مسائل میں ڈوب کر حقائقِ انسانی کا پتہ لگایا ہے، انسانی حس کی گہرائیوں کو ناپا ہے، غرض کہ اس کی شاعری کیا ہے اور کیا نہیں یہ انیس خود ہی بتا سکتا ہے۔

ہو جائے مُلکِ نظم بس نظم و نسق مرا
ہے سہل ممتنع یہ کلام اَدق مرا
برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہووے سبق مرا

کے اس حصے کی وضاحت کی ہے۔ جسے عام طور پر رزم کا نام دیا جاتا ہے اور جسے اردو مرثیے کا بہت خاص حصہ سمجھا جاتا ہے
اگرچہ اُردو مرثیے کا آغاز دکن میں ہوا اور دکنی شعراء نے بہ نیت ثواب متعدد مرثیے لکھے۔ لیکن ان کی حیثیت تاریخی ہے اُردو مرثیے کے ارتقاء میں انہیں نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا اور ان کی ادبی حیثیت کے بارے میں کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔

مرثیے کی ادبی حیثیت کی نشوونما اودھ کی سرزمین پر ہوئی۔ یہاں اس کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ یہیں اس نے ادبی صنعت کا روپ اختیار کیا اور یہیں کے باکمالوں نے اس کو پر وقار اور پر عظمت بنا دیا۔ مرثیے مرزا سودا نے بھی لکھے اور وہ مرثیے کے سلسلے میں ایک خاص نقطۂ نظر بھی رکھتے تھے۔ اور مرثیہ گوئی کو بہت مشکل سمجھتے تھے۔ سودا کے بعض معاصرین سکندر، گدا اور مسکین نے صرف مرثیہ گوئی ہی کو اپنا شعار بنایا اور اس طرح مرثیہ اپنا ارتقائی سفر طے کرتا رہا۔ مداحیٔ اہلِ بیتؑ بذاتِ خود ایک مستحسن عمل ہے۔ اس پہ اودھ کے فرمانرواؤں اور امراء کی قدردانی نے مرثیہ گویوں کا دل بڑھایا اور یہ صنف بہترین تخلیق اور فنی صلاحیتوں کا اظہار بن گئی۔

اس ضمن میں پہلا نام مظفر حسین ضمیرؔ کا ہے۔ ضمیرؔ نے مداحیٔ اہلِ بیتؑ اور مصائب امام مظلوم کو ایک دلدوز مرقع کی شکل میں پیش کیا۔ انہوں نے قواعد مرتب کئے۔ صورت شکل متعین کی۔ ضمیرؔ سے پہلے مرثیے کی کوئی خاص شکل متعین نہیں تھی۔ ضمیرؔ نے مسدس کو اس صنف کے لئے مخصوص کیا اور پھر یہی نہیں اس کے اجزاء کا تعین بھی کیا۔ ابتدائی حصے کو چہرے کا نام، اس کے بعد کا حصہ جس میں تمہید سے مرثیے کے خاص موضوع کی طرف آیا جاتا ہے۔ ماجرا کہلایا، ماجرا سے گویا مرثیے کا اصل حصہ شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی واقعات اسی میں بیان کئے جاتے ہیں۔ تیسرا حصہ رخصت کے نام سے موسوم ہے امام عالی مقامؑ یا ان کے کسی جاں نثار کا میدان جنگ میں جانے کے لئے عزیزوں سے رخصت ہونا اس کے بعد آمد کا بیان ہوتا ہے۔ میدان میں آمد آمد، اب اس کے بعد جو حصہ سامنے آتا ہے اسے سراپا کا نام دیا گیا۔

سراپا میں مرثیہ گو اپنے ہیرو کی تمام خصوصیات کو اجاگر کرتا ہے۔ اور اپنے فن کا کمال دکھاتا ہے۔ ہیرو میدان میں آچکا ہے۔ اس کی شخصیت واضح ہو چکی ہے۔ اب معرکۂ کارزار کا بیان ہے۔ عہد قدیم کے دستور کے مطابق رجز پڑھے جاتے ہیں۔ فوجِ اعدا کو فخریہ انداز میں اپنے آباؤ اجداد کے نام اور کارناموں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ اپنی شجاعت اور دلیری کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ اور پھر رزم کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ رزم کے بعد شہادت، بین اور پھر خاتمہ اور دعا۔ یوں تو مرثیے کا ہر حصہ اپنے انداز و آہنگ کی وجہ سے ایک خاص کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن رزم کے بیان میں شاعر محض خیال آرائی سے کام نہیں لے سکتا۔ میدانِ جنگ کی کیفیت گھمن گرج، حملے کی تیاریاں، اسلحۂ جنگ کا تذکرہ، تلوار کی صفائی، گھوڑے کی چستی اور چالاکی، مبارز طلبی، دست بدست جنگ، جنگ کی پوری تفصیل ان سب میں شاعر صرف خیال و قیاس سے واقفیت کا رنگ نہیں ابھار سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ذاتی مشاہدہ بھی ضروری ہے۔ اور انداز بیان میں وہ شکوہ اور زور بھی جس سے جنگ کی

یہ کیفیت کا اظہار پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے مرثیہ گو شعراء نے رزم کے بیان میں تسلسل اور روانی سے کام لیا اور واقعات جنگ کو اس انداز سے پیش کیا کہ پیچ اور ہی تصویر سامنے آجائے۔ ضمیرؔ نے مرثیے کی تشکیل نو میں ان تمام باتوں کا خیال رکھا۔ ان کے عہد کا لکھنؤ اگرچہ عیش و عشرت کے ماحول میں ڈوبا ہوا تھا۔ تاہم سپہ گری کے آثار باقی تھے اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اس فن شریف کے فروغ میں کوشاں رہتے تھے۔ میر ضمیرؔ نے اپنے عہد کے اس عمومی رجحان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور رزم نگاری میں نیا رنگ پیدا کر دیا۔

رزم نگاری

میر ضمیرؔ کی رزم نگاری میں تفصیل بھی ہے۔ پہلوانوں کی گفتگو بھی ہے۔ جنگ کے مختلف داؤ پیچ بھی ہیں اسلحہ کے استعمال کا بیان بھی ہے۔ اور یہ سب اس طرح ہے کہ پڑھنے والوں کے سامنے لڑائی کا پورا پورا نقشہ آجاتا ہے۔ یہ دیکھیے۔ حضرت قاسمؑ اور مشہور پہلوان ازرق میں جنگ ہو رہی ہے۔ بیان کتنا واضح واقفیت سے لبریز اور حقیقی ہے:-

نیزے کی میں کیا ردّ و بدل کا کہوں عالم　　قاسمؑ نے کئی وار تو خالی دیئے اُس دم
نیزے کی انی پر وہ انی روک کے پیہم　　آخر اسد اللہ کا پوتا ہوا برہم
سینے پہ غرض وار کیا اس نمک و دو سے
دو ہاتھ نکل آئی سناں پشتِ عدو سے

یاں کرنے لگے قاسمؑ و ازرق ہنر اظہار　　خالی ہوئے ترکش تو چلے نیزۂ خونخوار
نیزے بھی جو ٹوٹے تو پھرے ہو کے نگوں سار　　سب وار تو خالی گئے باقی رہی تلوار
قاسمؑ نے لیا میاں سے تیغِ دو زباں کو
ازرق نے اٹھایا اُدھر اک گرزِ گراں کو

وہ گرز کو لے کر جو ہوا مستعدِ جنگ　　قاسمؑ نے کہا دل سے کباب کرتا ہوں جو زنگ
قاسمؑ کو تو لُنتے تھے بھلاؤں کے بڑے ڈھنگ　　ازرق کو کہا کھل گیا گھوڑے کا ترے تنگ
واں گھوڑے سے وہ تنگ کی جانب رجھکا تھا
یاں گھوڑے سے یہ تنگ تلک کاٹ چکا تھا

رزم کا یہ بیان مؤثر ہے۔ آنکھوں کے سامنے ایک تصویر کھنچ جاتی ہے، نیزہ، تلوار، گرز، سب کا بیان ہے اور یہ بیان رسمی اور تخیلی نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر ضمیرؔ نے سچی واقعات نگاری سے کام لیا ہے۔ الفاظ کی صنعت گری اور عام شاعرانہ طرز سے انحراف کر کے ایک نیا آہنگ وضع کیا ہے۔ جو اردو شاعری میں ان سے پہلے موجود نہیں تھا۔

جنگ کا ایک اور منظر دیکھیے۔ یہ بیان حضرت عباسؑ کی رزم کا ہے۔ اور یہاں بھی وہی کیفیت ہے۔

تب کھینچ کے شمشیر گرے اس پہ جواں چند　　جوں برق گرا اُن پہ ید اللہ کا فرزند
آیا کوئی نزدیک تو ہو خرم و خورسند　　پھینکا اسے بالائے ہوا تھام کمربند
گرتے ہوئے پر تیغ لگائی وہ جبیں پر
اک وار میں دو ہو کے گرا روئے زمیں پر

بالائے سپر تیغ چمکتی تھی دمِ جنگ　　بجلی کی چمک ابرِ سیہ مست میں جس رنگ
سے چلتی تھی راکب کا جو خود و زرہ و تنگ　　کہتی تھی کہ اب گاڑ زمیں ہے مرا چورنگ
عباسؑ اسے روک نہ لیتے جو زمیں پہ
تا روزِ ابد پھر نہ ٹھہرتی وہ کہیں پہ

رزم کے بیان کو زیادہ مؤثر اور باوقار بنانے کی غرض سے میر ضمیرؔ نے تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی اس سلسلے میں شامل کی جسے بعد والوں نے من و عن قبول کیا۔

مرثیہ گوئی میں ضمیرؔ کے نامور معاصر خلیقؔ تھے۔ یہ وہی خلیقؔ ہیں جن کے والد میر حسنؔ نے "سحر البیان" لکھ کر اپنی ساحری سے سب کو مسحور کر دیا تھا اور جن کے نامور صاحبزادے میر انیسؔ نے مرثیہ گوئی کی دنیا میں وہ مرتبہ اور مقام حاصل کیا جو اپنی نظیر آپ ہے۔

ضمیرؔ کی طرح خلیقؔ کے یہاں رزم کا اتنا تفصیلی اور مؤثر بیان نہیں ملتا۔ ان کا رنگ و آہنگ بالکل الگ ہے۔ خلیقؔ جذبات نگاری میں بے مثال ہیں۔ امامؑ عالی مقام اور ان کے رفقائے کرام کے وقار، مرتبے اور عظمت کو انہوں نے بڑے کمال کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور مناظرِ فطرت کے خوبصورت مرقعے تیار کئے ہیں۔ پھر بھی خلیقؔ رزم کو مرثیے کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ تفصیل نہ سہی، اختصار ہی سہی مگر اس اختصار میں بھی حسن اور واقعیت ہے۔ امام حسینؑ کی جنگ کا یہ منظر قابلِ توجہ ہے۔

یہ کہہ کے کمانداروں پہ پھر جا پڑے شبیرؑ　　اس شاہ پہ پہلے جو چلے تھے سو چلے تیر
بجلی سی چمکنے جو لگی حیدری شمشیر　　آگے سے کہیں بھاگ گئے پائے نہ دھرے پیر
کاہے کو کبھی ایسے بہادر سے لڑے تھے
میداں میں کماندار ہی ستھراؤ پڑے تھے

ترکش تھے کہیں ٹکڑے، کہیں تیر زمیں پر　　اور ساتھ کمانوں کے گرے ہاتھ بھی کٹ کر
افتادہ کہیں بازو کہیں پاؤں کہیں سر　　کچھ پھینک کمانوں کو گئے بھاگ بد اختر
کچھ ایسے مُسلّح تھے کہ رہتے ہی میں سجے تھے
پر خوف سے بھاگے ہوئے گوشے میں پڑے تھے

ضمیرؔ اور خلیقؔ کے بعد اُردو مرثیے کا دورِ عروج شروع ہوا۔ ضمیرؔ کے شاگرد مرزا دبیرؔ اور خلیقؔ کے صاحبزادے میر انیسؔ نے اس صنف کو آسمان پر پہنچا دیا۔

مرثیے کے اصول

میر ضمیرؔ نے دورِ تشکیل میں جو اصول وضع کئے تھے۔ جن قاعدوں کو برتا تھا جو انداز اختیار کیا تھا انہیں دو دبیرؔ نے اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اپنے الگ راستے نکالے، میر انیسؔ نے صفائی، سادگی، فصاحت اور بے مثال مصوّری کو اپنا شعار بنایا، زبان و بیان کی خاندانی روایت سے فائدہ اُٹھایا۔ انہوں نے رزم کو جس خوبی، صفائی، برجستگی اور شکوہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اُردو شاعری کا لازوال سرمایہ بن گیا ہے۔ رزم کے اس مرقع میں ہر چیز بڑے مناسب اور فنکارانہ انداز سے پیش کی گئی ہے۔ ہر منظر اپنی جگہ مکمل اور بھرپور ہے۔ باکمال فنکار نے جذبات کا خاص خیال رکھا ہے۔ جنگ شروع ہونے کو ہے۔ دونوں طرف تیاریاں ہو رہی ہیں اور پھر نقارے پر چوٹ لگی۔ یہ جنگ شروع ہونے کا اعلان ہے۔ میر انیسؔ اس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں :-

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بہ یک — اٹھا غریوِ کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک — قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتی تھی وہ سب وادئ نبرد — گردوں میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخِ چارمیں پہ رُخِ آفتاب زرد — ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجوم فوج سے وہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد — مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد — تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے ان کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

ہنگامۂ جنگ کے اس بیان میں شاعر کے مشاہدے اور تخیل دونوں کے امتزاج سے ایک بھرپور تصویر ابھری ہے۔ اس تصویر میں شاعر نے مبالغے سے کام لے کر زور و اثر میں اضافہ کیا ہے۔ فن کار کسی چیز کو بالکل اسی طرح پیش نہیں کرتا جس طرح کہ وہ ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے تخیل کی مدد سے اس چیز کو نیا اور انوکھا بنا دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کی حقیقت اور صداقت کو پوری طرح برقرار رکھتا ہے۔ میر انیسؔ نے رزم نگاری میں اس نکتہ کو مدِنظر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی رزم نگاری دوسروں کے مقابلے میں

زیادہ کا مہاب ہے۔ ہنگامۂ جنگ کا انداز تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب اصل جنگ کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے۔ کہ میر انیس واقعات کو کس طرح اپنی گرفت میں لے کر بیان کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں :-

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو جو نکال   چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں!   ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
عل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر   قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزہ دشمن کو تھام کر   جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

یہاں رزم نگاری اپنے کمال پر ہے۔ یہاں یہ جنگ کی متحرک تصویر بھی ہے۔ داؤ پیچ، صفائی، مستعدی، شجاعت، جذبۂ سرفروشی سب کچھ اپنے اپنے مقام پر موجود ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انیس نے یہ جنگ بچشم خود دیکھی ہے۔ حقیقت اور تخیل آپس میں اس طرح مل جل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انیس کا فن اور کمال ہے جس کے وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اور پھر بیان میں غضب کی روانی اور برجستگی ہے۔ بیان کی روانی اور برجستگی نے رزم کے اس مرقعے کو اور زیادہ جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔

مرزا دبیر کا انداز بالکل الگ تھا۔ ان کی خصوصیت، معنی آفرینی اور مشکل پسندی ہے۔ ان کا مزاج عالمانہ اور نظر وسیع تھی۔ نئے نئے مضمون اور پیرائے تلاش کرنے میں انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ مرثیہ نگاری کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے رزم کی طرف خصوصی توجہ کی اور اپنا انداز یہاں بھی قائم رکھا۔

مرثیہ گو شعراء نے رزم نگاری کے سلسلے میں تلوار کی تعریف بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ تلوار کی آبداری، جوہر، کاٹ اور پھر بازوئے شمشیر زن کی مستعدی سب کو نئے نئے پیرائے سے بیان کر کے رزم کو زیادہ پہلو دار بنایا ہے۔ مرزا دبیر تلوار کی خصوصیات بیان کر رہے ہیں۔ اپنے رنگ و آہنگ میں جہاں معنی کے پھول کھلتے رہتے ہیں :-

پھل وزن میں تھا پھول، تجلی میں نخل طور   گرمی میں محض نار، تو نرمی میں صاف نور
آسیب سایہ، چال پری، قبضہ چشم حور   خود لہر، آب زہر، تڑپ قہر، شور صور
یوں دفعتاً زمین سے گئی آسمان کو
جس طرح غصہ آئے کسی ناتوان کو

سیب بہشت، رونقِ اسلام، فتح جنگ — الماس تیغ شہ کا تھا یہ سنگ رنگ ڈھنگ
چمکی جو یہ سروں پہ سواروں کے سیلے ورنگ — یوں جی چھٹے دلیروں کے تنوں سے جیسے ڈنگ
نے گردنیں تھیں دوش پہ نے فرق خود میں
تیغِ علیؑ تھی خود میں سر ان کے گود میں

سایہ دو نیم رنگ دو نیم اور بو دو نیم — رُو کا یہاں شمار ہے کیا آبرو دو نیم
ہر بار چار آئینہ تھا چار سو دو نیم — سینے میں دل تو دل میں ہر اک آرزو دو نیم
دل خوب اس کی کاٹ کی لذت سمجھتا تھا
کٹتی تھی جو گھڑی وہ غنیمت سمجھتا تھا

یہ رنگ بالکل الگ ہے حقیقت تو ہے لیکن تخیل کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے، یہاں زور حقیقت پسندی پر نہیں بلکہ لطیف استعاروں اور نازک خیالی پر ہے، سایہ، رنگ، بو، رُو، آبرو سب کو دو نیم کرنے کے لئے شاعر نے نئے نئے تلازمے اختیار کئے ہیں۔ تلازموں کی تلاش میں وہ بہت کامیاب اور معنی آفرینی میں ممتاز نظر آتا ہے۔ لیکن رزم کے انداز میں جلال کے بجائے جمال کا عنصر نمودار ہو گیا ہے۔

جنگ کے بیان میں بھی مرزا دبیر نے اسی جدّت طرازی سے کام لیا ہے۔ بیان کے نئے نئے پیرائے تلاش کرنے میں انہیں خاص لطف آتا ہے۔ لیکن رزم کو پُر زور بنانے کی طرف ان کی توجہ کم ہوتی ہے اور پھر وہ اکثر اوقات محض الفاظ سے واقعات کی کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ایک طرح کی ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر بھی دبیر رزم میں اپنا رنگ دکھا ہی دیتے ہیں۔ لیجئے یہ منظر دیکھئے۔ حضرت علی اکبرؑ ایک نامی پہلوان سے جنگ کر رہے ہیں:۔

تھا بازو تائیدِ خدا میں قمر شاہ — عقرب کے طریقے سے بڑھا طارق گمراہ
نیزہ نہ کہو نیش تھا عقرب کا سوئے ماہ — ہنس نے کہا جا تجھے غارت کرے اللہ
شب رنگ نئے رنگ سے موذی کا بڑھا تھا
طاؤس جہنم پہ مگر سانپ چڑھا تھا

گو نیزے کے فن میں بہت اس نحس نے کد کی — ہر طعن پہ لعن اس کو ملی ربِّ صمد کی
پھر آئی میں عجب شکل تھی اس سرو سے قد کی — بس فرق میں اک نقطے کے تو نیزے کی رد کی
پھر کان پہ توسن کے رکھا نیزہ ہلا کر
بالبس ہوئے تیر کو پیکاں سے ملا کر

اس نیزے سے یہ سہم کے تڑپا وہ کمینہ　　بھاگا ہوا آگے سے گیا پشت پہ سینہ
نیزہ جو لگا سینے میں رنے دل تھا نہ کینہ　　یہ سانپ خزانے کا وہ کافر کا خزینہ
سرکا تو دبے پاؤں سرہانے اجل آئی
دو ہاتھ سناں پشت سے باہر نکل آئی

حضرت علی اکبرؑ اس پہلوان پر فتحیاب ہوتے ہیں۔ اسی منظر کو میر انیس نے بھی بہت ہی عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے :۔

آیا اڑا کے رخش وہ جس دم قریب زد　　ہمشکل مصطفےٰؐ نے کہا یا علیؑ مدد
پشتی پہ ہوئے شیر الہیٰ سا جس کا جد　　ہوتا ہے کیا حریف کرے لاکھ جد و کد
دریائے موج خیز پہ تنہا وہ حباب تھا
زہرہ شقی کا آنکھ ملاتے ہی آب تھا

بھالا سنبھالا دشمن ایماں نے مل کے ہاتھ　　نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی تک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ　　بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا بل کے ہاتھ
کم تھے نہ یہ بھی زور میں گر وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا

خالی گئیں سبھی ہوئی چوٹیں جو اس کی سب　　منہ کو پھرا پھرا کے شقی کاٹتا تھا لب
تلوار کو اٹھا کے پکارا وہ شیر تب　　ہشیار او لعیں اجل آتی ہے سر پہ اب
مہلت ابھی ہے تیغ و سپر کو سنبھال لے
باقی ہو کچھ ہوس تو اسے بھی نکال لے

سن کر برس پڑا وہ جفاکار و بدگہر　　رد کر کے سارے وار بڑھا شاہ کا پسر
لہرا رہی تھی فرق پہ وہ ماہیٔ ظفر　　مارا جو ہاتھ برق سی کوندی قریب سر
چھوڑا سوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

مرزا دبیر نے تلوار کی تعریف جس طرح کی ہے وہ آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اب ذرا انیس کی زبان سے تلوار کی تعریف سنئے انیس نے صفائی کی تھی کہ میں تلوار کی تعریف اس طرح کرجاؤں کہ :۔

جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

انیس کی یہ دعا حرف بہ حرف قبول ہوئی :-

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے — تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے — دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانئے ملا تھا مزہ کیا زباں کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخواں کو

نیزوں کے بند بند قلم، برچھیاں دو نیم — مثل قلم زبانِ دراز و سناں دو نیم
چار آئینے کٹے ہوئے گرز گراں دو نیم — مغفر سے تا کمر جسدِ پہلواں دو نیم
عالم تھا پیش آئینہ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کون سا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

تلوار کی تعریف کرتے ہوئے میر انیس نے غزل کا لطف بھی کہیں کہیں پیش کیا ہے۔ "رزمیہ میں غزل کی چاشنی" یہ بند بے مثال ہے :-

زیبا تھا دم جنگ پری وش اسے کہنا — معشوق بنی، سرخ لباس اس نے جو پہنا
اس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا — جوہر تھے کہ پہنے تھی دلہن پھولوں کا گہنا
بیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شبیرؑ سے دولھا کی بغل میں

مرثیے اور رزم نگاری دونوں کا دورِ عروج، میر انیس اور مرزا دبیر کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ میر انیس کے بعد ان کے خاندان کے دوسرے باکمال شعراء نے مرثیہ گوئی کی روایت برقرار رکھی، لیکن ساتی ناموں کے اضافے اور تغزل کے رنگ سے اس روایت کو رنگ لیا۔ رزم نگاری بھی قائم رہی۔ مگر میر انیس کا سا زور باقی نہ رہا اور سچ بھی یہی ہے۔ کہ اردو شاعری میں رزم کا زور طنطنہ، گرماگرمی، جوش و خروش اور شوکت و شکوہ دیکھنا ہو تو میر انیس کے مرثیوں میں دیکھئے، رزم نگاری کا سارا حسن یہیں ملے گا۔ یہی رزم اردو شاعری میں بے مثال ہے۔

بجناب باقر زیدی
علی گڑھ

انیسؔ کے ایک مرثیہ کا تجزیہ

انیس کے مرثیوں پر اب تک جو تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ ان کا دائرہ صرف ان کے اندازِ بیان اور محاسنِ کلام تک محدود رہا ہے۔ کسی نے فصاحت کو اجاگر کیا ہے کسی نے بلاغت کو اور کسی نے منظر نگاری کو ان کے کلام کا مخصوص جزو قرار دیا۔ لیکن وہ کونسے اجزا تھے۔ جس پر انیسؔ نے مرثیہ کا ڈھانچہ مرتب کیا اس پر اب تک کسی کی توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ اس بات سے کون اتفاق نہیں کرتا کہ لکھنوی مرثیہ نگاروں نے عالمی ادب کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ اور اردو تنقید مجموعی طور پر غزل کے زندان میں اسیر رہی ہے۔ ہمارے ناقدین نے دوسری اصنافِ سخن پر اب تک اتنی توجہ نہیں کی جتنی توجہ کی وہ مستحق ہیں۔ ان اصنافِ سخن میں مرثیہ بھی شامل ہے۔

اس قسم کی باتیں تو بہت ہوتی رہی ہیں کہ ان مرثیوں میں منظر نگاری ناقص ہے۔ محاکات مثالی ہے اور یہ کہ ان مراثی کا شمار رزمیہ شاعری میں ہونا چاہیئے یا المیہ وغیرہ میں لیکن اب تک مرثیہ کو ایک علیٰحدہ صنفِ سخن مان کر ان کا تجزیہ نہیں کیا گیا چنانچہ شبلی جیسی شخصیت نے بھی اپنے موازنہ میں صبح کے منظر کا صبح کے منظر سے، رزم کا رزم سے اور بزم کا بزم سے مقابلہ کرکے اپنے بیان کو تکمیل کی منزل پر لا کر چھوڑ دیا۔ صبح کے مناظر مکالموں یا لڑائیوں کے حسن و قبح سے الگ ہو کر ادب کے طالبعلم کا ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ دیکھے کہ پوری نظم کے جزو کے میں یہ صبح کا منظر اور لڑائی کا بیان سماتا بھی ہے یا نہیں اور یہ بھی طے کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ان مرثیوں کو مکمل نظم کہہ سکتے یا نہیں اور اگر یہ نظم ہے تو اس کا نظام کیا ہے۔ اس لئے ہم یہاں یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے ایک مرثیہ کو اکائی ([illegible]) مان کر اس کے نظامِ شعر کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ کیا ہم مرثیہ کو ایک مکمل نظم کہہ سکتے ہیں ؟

انیسؔ جس دور میں شاعری کر رہے تھے۔ اس عہد میں ایک طرف تو داستانیں لکھی جا رہی تھیں اور دوسری طرف مثنویاں نظم و نثر کی ان دونوں اصناف پر غزل کی چھاپ تھی۔ ان دونوں رائج اصناف کے علاوہ چھتر منزل میں راس لیلا بھی ہوتی تھی۔ یعنی لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں ناٹک بھی شامل ہو چکا تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مراثی پر غزل، مثنوی اور داستانوں کا اثر تو تھا ہی۔ اس کے علاوہ اس کے اجزائے ترکیبی میں ناٹک کے جزئیات بھی شامل ہو چکے تھے۔ اس لئے ان مرثیوں کا مطالعہ کرتے وقت ان اثرات پر بھی نگاہ رکھنی لازم ہے۔

انیسؔ کے جس معرکۃ الآرا مرثیہ کا ہم تجزیہ کر رہے ہیں اس کا مطلع ہے "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" مرثیہ

لفظ جب سے شروع ہوتا ہے۔ جس سے ایک تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنی کہانی درمیان سے شروع کرنے کی کوشش کی ہے اور دوسرے اس لفظ سے ایک طرح کا تجسّس (SUSPENSE) بھی پیدا ہوتا ہے۔ منظر یہ ہے کہ آفتاب نے رات کا سفر طے کر لیا ہے۔ صبح کاذب کا وقت ہے اور اس عالم میں ایک آدمی آسمان کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے۔ انیس اس کا نام نہیں بتاتے بلکہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں "دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے" گردوں رکاب کی صفت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ صبح کے دھندلکے میں لپٹا ہوا یہ آدمی کوئی معزز شخص ہے یہ آدمی آسمان کی طرف دیکھنے کے بعد مڑتا ہے اور اپنے دوستوں کو آواز دیتا ہے:

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو   اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

اب تک ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ کون لوگ ہیں، لیکن دوسرے بند کے دوسرے مصرعے سے ہمیں ان لوگوں کے بارے میں کچھ علامتیں ملنے لگتی ہیں۔ کیونکہ وہ آدمی صرف یہ کہہ کر چپ نہیں ہو جاتا ہے کہ آؤ نماز پڑھو بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ:

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا   یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا

اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ:

چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہراؑ کے لال کا!

اب یہاں آکر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہِ گردوں رکاب جو آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا در اصل زہراؑ کا لال ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کوئی جنگ ہونے والی ہے جس میں محمدؐ کی آل کا خون بہے گا۔

شروع کے بندوں میں شاعر ہمیں ذہنی طور پر اس حادثہ کے لئے تیار کر دیتا ہے اور ہم ایک خونریز لڑائی کے واقعات پڑھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس مرثیہ کا پہلا منظر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن پہلے اور دوسرے منظر کے درمیان ایک بند کا وقفہ ہے۔ اس ایک بند میں امام حسینؑ اپنے ساتھیوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اٹھے   دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے!

یہ سن کر امامؑ کے رفقاء اپنے بستروں سے اٹھتے ہیں۔ لباس تبدیل کرتے ہیں اور جار آئینے سے درست ہو کر امامؑ کے پاس آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ جس وقت حسینؑ کے رفقاء باہر نکلنے کے لئے لباس تبدیل کر رہے ہوتے ہیں، شاعر ہم سے ان کا تعارف کراتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ہم شاعر کو الیس کے کورس یا داستانوں کا راوی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فیاض، حق شناس، اولوالعزم، ذی شعور، خوش فکر، بذلہ سنج اور غیور ہیں۔ اور فنِ تقریر میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ "باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے" یہی نہیں بلکہ یہ لوگ صاحبِ وقار، آسماں جاہ اور دلیر بھی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ "فاقوں میں دل بھی چشم بھی اور نیت بھی سیر" مختصر یہ کہ:

پتھر میں ایسے لال صدف میں گہر نہیں   حوروں کا قول تھا یہ ملک ہیں بشر نہیں

اس کے نو بندوں میں صبح کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس منظر اور ایسے ہی دوسرے مناظر کے بارے میں ناقدین نے یہ الزام لگایا ہے کہ یہ کربلا کی صبح نہیں ہو سکتی۔ انیس خود اسے کربلا کی صبح نہیں کہتے:

اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا!

اس کے بعد دوسرا مصرع آتا ہے: وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور!

انیس اس میں کربلا کی منظر نگاری نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صبح کی تعریف کر رہے ہیں۔ یعنی داستان رک جاتی ہے اور بات میں بات پیدا کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ شاید ابھی نماز صبح کا وقت نہیں ہوا ہے۔ اس لئے شاعر ہمیں اپنی طرف متوجہ کر کے ایک بے مثال قصیدہ صبح کی شان میں سناتا ہے۔ اس قصیدہ کی منزل سے وہ گریز کرتا ہے اور وہ "صبح کی منزل سے گریز" "دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان" کی منزل پہ آجاتا ہے۔ لیکن ابھی نماز صبح کا وقت نہیں ہوا ہے۔ اس لئے وہ دو بندوں میں امام کے خیمہ گاہ کی تعریف کر ڈالتا ہے کہ اسی اثنا میں نماز صبح کا وقت ہو جاتا ہے اور اب وہ اس طرح کہتا ہے۔

ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں ۔۔۔ تشریف جا نماز پہ لائے شہ زماں
سجادے بچھ گئے عقب شاہ انس و جاں ۔۔۔ صوت حسن سے اکبرؑ مہرو نے دی اذاں
ہر ایک چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسول کی کانوں میں آگئی

یہاں ما فوق الفطرت عناصر داستان میں داخل ہوتے ہیں یعنی اکبرؑ نے اذان دی آواز سنتے ہیں آگئی لیکن نماز کا اختتام اس لئے کہیں آئی کہ خیمہ گاہ سے مخدرات کی آہ و بکا کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ قاری یک لخت ان خیموں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ہم وہاں دیکھتے ہیں کہ حضرت زینبؑ جناب علی اکبرؑ کی اذان پر آہ و بکا کر رہی ہیں۔ تیسری طرف عمر سعد کے لشکر میں کچھ اور ہی انتظامات ہو رہے ہیں۔

دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسینؑ کو ۔۔۔ ہاں مرتے دم تک نہ دیجیو پانی حسینؑ کو

یہاں یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وضو کے لئے پانی نہیں تھا بلکہ فوج حسینی پر دو روز سے پانی بند تھا۔

نماز ختم کر کے ابھی فوج حسینی جانماز پر بیٹھی تھی کہ ناگاہ قریب آ کے گرے تین چار تیر۔ حسینؑ کے رفقا اور عزیزوں نے تلواریں سنبھال لیں اور حسینؑ نے اکبرؑ سے کہا کہ وہ اندر جا کر مخدرات عصمت و طہارت سے کہہ دیں کہ بچوں کو لے کر صحن سے ہٹ جائیں کیونکہ لڑائی شروع ہونے والی ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ،

فضہ پکاری ڈیوڑھی سے اے خلق کے امیر ۔۔۔ ہے ہے علیؑ کی بیٹیاں کس جا ہوں گوشہ گیر
اصغرؑ کے گاہوارے تک آ کر گرے ہیں تیر ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ
اٹھے یہ شور سن کے امام فلک وقار ۔۔۔ ڈیوڑھی تک آئے ڈھالوں کو روکے رفیق و یار
فرمایا مڑ کے چلتے ہیں اب بہر کار زار ۔۔۔ کمریں کسو جہاد پہ منگواؤ راہوار

یہ کہتے ہوئے حسینؑ خیمے کے اندر گئے جہاں ایک کہرام بپا تھا۔ روتی ہوئی مخدرات کو دیکھ کر حسینؑ کہتے ہیں:

موقع نہیں بہن ابھی فریاد و آہ کا ۔۔۔ لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

حسینؑ نے ہتھیار لگائے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ علمداری کس کو سونپی جائے۔ زینبؑ کے چھوٹے بچے مصر ہیں کہ ان کے دادا کا عہدہ انہیں دیا جائے۔ زینبؑ انہیں سمجھاتی ہیں چونکہ معاملہ زینبؑ کے بیٹوں کا ہے اس لئے زینبؑ ہی سے کہتے ہیں کہ وہ اس کا فیصلہ کریں اور اس کے جواب میں زینبؑ کہتی ہیں:

گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام　　شوکت میں قد میں شان میں ہمسر کوئی نہیں

عباسؑ نامدار سے بڑھ کر کوئی نہیں!

مختصر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اکبرؑ چچا کو بلا لاتے ہیں اور زینبؑ انہیں لشکر کا علم دے دیتی ہیں۔ عباسؑ علم لے کر بڑھتے ہیں۔ یہ لوگ خیمے سے باہر آتے ہیں۔ حسینؑ گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور یہ فوج صف بندی کرتی ہے کہ ادھر سے پھر تیر آتے ہیں۔ حسینؑ اتمامِ حجت کے لئے انہیں سمجھاتے ہیں۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہوتی ہے۔ یہ جنگ سات بندوں میں ختم ہوتی ہے۔ اور اب ہم لڑائی کی اس منزل میں آتے ہیں۔ جو لڑائی شاعر دکھانا چاہتا ہے:

اس مرثیہ میں انیسؔ نے رخصت بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ براہِ راست حسینؑ کی جنگ پر آجاتے ہیں اور تقریباً ۴۴ بندوں میں لڑائی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ الغرض یہ جنگ اب اس منزل پر پہنچتی ہے کہ عمر سعد کے لشکر میں افراتفری پھیل جاتی ہے اور حسینؑ کی ساری جنگ اس ایک مصرع میں سمٹ جاتی ہے۔

اللہ کا غضب ہے لڑائی حسینؑ کی

گھر والوں کا واسطہ دیا گیا تو حسینؑ آبدیدہ ہو گئے اور بولے:

لو اب کہ ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں!

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک پہلوان کو جوش آتا ہے اور وہ نیزہ لئے حسینؑ کی طرف تیزی سے بڑھتا ہے۔ جس کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پہ سوار تھا!

اس کے بعد آٹھ نو بندوں میں حسینؑ کی لڑائی کا حال بیان کیا گیا ہے:

اب شاعر کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ وہ شخص جو دلیری سے لڑ کر لشکروں کے منہ پھیرے اُسے شہید کس طرح کیا جائے چنانچہ،

آئی ندائے غیب کہ شبیرؑ مرحبا　　بس اب نہ کر وغا کی ہوس لے حسینؑ بس

وقت نماز عصر ہے بس اے حسینؑ بس!

چنانچہ اب حسینؑ کیا کرتے انہوں نے تلوار روک لی اور ہاتف کی اس ندا کے ساتھ ہی ہم اس داستان کے منطقی انجام یعنی ہیرو کی شہادت تک آجاتے ہیں اور اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نظم میں ڈرامائی تسلسل ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ مرثیہ میں کسی جگہ بھی کوئی جھول ڈھیلی نظر نہیں آتی۔ اور ہر چیز اپنے آنے والے حصے سے ملتی ہے۔

یہی وہ عناصر ہیں۔ جن پر انیسؔ نے اپنے مرثیوں کا ڈھانچہ تیار کیا تھا۔

سیّد محمد امیر امام تحرؔ

تین ہم عصر

غالبؔ ——— دبیرؔ ——— انیسؔ

کسی بھی زبان کے ادب میں تین ممتاز خصوصیات ضرور موجود ہوتی ہیں۔ جو تکلّم و تفکّر کی استعداد و صلاحیت کی تین مختلف لیکن باہم متعلق سطحوں سے مربوط ہوتی ہیں: (۱) الفاظ و کلمات اور لسانی خصوصیات مثلاً سلاستِ زبان یا تنوع کلمات وغیرہ (۲) اس کے بعد ذرا اور زیادہ گہرائی پر جا کر حسن و کمال فطرت نگاری جس کے ضمن میں واقعہ نگاری، منظر نگاری، محاکات، مکالمہ اور نفسیاتی کیفیات کا بیان' سب ہی اُمور کا شمار ہوتا ہے اور اسی سبب سے ادب کی ان خصوصیات کا تعلق تکلّم و تفکّر کی کم و بیش عمیق تر سطح سے ہوتا ہے چونکہ اس میں الفاظ و کلمات اور لسانی خصوصیات کا ارتباط مشاہدۂ فطرت سے اور اس کے نتائج کے مناسب طور پر اظہار سے ہوتا ہے۔ (۳) اور پھر عمیق ترین سطح خصوصیات وہ ہوتی ہے جہاں لسانی خصوصیات اور استعداد اظہار و بیان و فطرت نگاری سے متعلق خصوصیات دونوں کا گہرا ارتباط ایسے تجربی عمل سے ہوتا ہے جس کے ضمن میں تعقّل اور تعمّقِ فکر و نظر اور بلندیِ تخیّل کے ساتھ کسی فلسفۂ حیات یا اخلاقیات کو تشکیل دے کر بیان کرنا ہوتا ہے۔

گو کہ ان مختلف خصوصیات اور ان سے متعلق سطحوں کا تجزیہ یہاں محض بغرض تشریح و تصریح پیش کیا گیا۔ لیکن یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ ان سب کا باہمی ارتباط و تعلق اس قدر گہرا اور پیچیدہ ہے کہ انہیں اس قدر آسانی سے علیحدہ علیحدہ تصور کرنا بھی مشکل ہے؛ ظاہر ہے کہ زبان پر قدرت' فطرت نگاری اور اس کے متعلق مشاہدات اور فلسفہ و اخلاقیات کے رموز و اسرار کا تفہّم و تفہیم' کلمات اور الفاظ کے ذخیرہ و تنوع پر یکساں طور پر مبنی و مقیم و متحرک نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے سے یہ تینوں امور اس قدر قربت رکھتے ہیں اور اس طرح ناگزیر طور پر متعلق معلوم ہوتے ہیں کہ ان کا ایک دوسرے سے الگ الگ مطالعہ بھی دشوار نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ محض بغرض بحث و تحلیل تو جائز ہے ورنہ اس کا کوئی اور جواز ہی نہیں معلوم ہوتا۔

یہاں یہ بھی یاد آوری ضروری ہے کہ ان تینوں ادبی خصوصیات اور ان سے متعلق امور کا بہت گہرا تعلق سماجی حالات سے بھی ہوتا ہے چونکہ خواہ زبان کی حدود و وسعت ہو یا بیان کی ارتقا ہو یا فلسفہ و اخلاقیات کی تشکیل' یہ سب کے سب ایسے اجتماعی عوامل سے مستفید ہو کر صورت پذیر ہوتے ہیں جیسے معاشی و اقتصادی اوضاع' سیاسی و

ثقافتی حالات اور سماج کی ماضی کی تاریخ اور اس کے حال کے واقعات کے درمیان ارتباط کی نوعیت۔ ان ہی سب سے ہر سماج کی اقدار و قیم اور اس کے افراد کی فکر و نظر ظہور پذیر ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا کسی بھی سماج اور کسی بھی عہد ادب کو سمجھنے کے لئے ان سب کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

غالبؔ و دبیرؔ و انیسؔ، یہ تین عظیم ہمعصر جس عہد اور جس سماج سے متعلق تھے وہ ہماری تاریخ میں ایک ایسا دور گذرا ہے جس کو ہماری تاریخ کا موڑ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس عہد اور اس کے سماج پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے قبل اس کے کہ ان کے کلام کو سمجھا جا سکے۔

اردو ادب کے ان تین ہمعصر نوابغ ادب کے گرد و پیش جو اجتماعی و معاشی و سیاسی حالات رونما ہو رہے تھے۔ ان میں برصغیر ہندوستان میں ایک طرف اہلِ ہند اور علی الخصوص مسلمانوں کا زوال اور دوسری طرف برطانوی اقتدار و تسلط کا عروج اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی سماج کا اخلاقی انحطاط اور معاشی بدحالی سب سے سنگین اور پریشان کن حقیقتیں تھیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا غالبؔ و دبیرؔ و انیسؔ کے کلاموں میں ان حقائق کا انعکاس ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اگر ہوتا ہے تو کس قدر اور کس طور پر۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ان تینوں ہم عصر شاعروں میں سے کسی نے بھی سیاسی رنگ کی شاعری نہیں کی تھی اور اپنے عہد کی سیاست پر کسی اہم ادبی تخلیق میں سیاسی انداز تحریر میں قلم اٹھایا تھا۔ البتہ انیسؔ و دبیرؔ کی شاعری میں دو متضاد قوتوں کا واضح مقابلہ و معرکہ ضرور ملتا ہے، وہی دو قوتیں جن کے متعلق اقبالؔ کہہ گئے ہیں کہ:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید   این دو قوت از حیات آمد پدید

اور ظاہر ہے کہ یہ ازلی و ابدی مقابلہ و معرکہ جو حیاتِ بشری و مجتمعِ انسانی کے ساتھ ساتھ ظہور پذیر ہوا اور جاری ہے اور شاید جاری رہے۔ وہ خود غالبؔ و دبیرؔ و انیسؔ کے عہد میں بھی کسی نہ کسی شکل و صورت میں جاری رہا ہوگا اور مزید یہ ان تینوں معاصرین نے اس مقابلہ و معرکۂ حیات در مجتمع اور اجتماعی و اقتصادی و معاشی کش مکش کو محسوس ضرور کیا ہوگا اور بخوبی محسوس کیا ہوگا کیونکہ وہ بحیثیت شاعر عام آدمی سے کچھ زیادہ شدت احساس رکھتے ہوں گے۔

یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ غالبؔ و دبیرؔ و انیسؔ کا عہد ہمارے سماج اور تمدن اور ہماری ثقافت اور تہذیب میں ادبی و شعری فکر و نظر کا دور تھا اور شعریت اور ادبیت کے عناصر ہماری اس عہد کی تہذیب و ثقافت پر چھائے ہوئے تھے اور ادب و شعر نہ کہ جدید اجتماعی علوم سے ہماری فکر و نظر ہمارے خیالات اور ہماری تقریر و تحریر متاثر تھی۔ اس لئے اس دور میں ہمارے سماج کے فکری اور جذباتی تقاضوں اور ان سے متعلق فکری اور جذباتی تاثرات اور ردِ عمل کا بھی ادبی و شعری پیرایۂ تقریر و تحریر میں رونما ہونا ایک لازمی امر تھا اور دوسری طرف اسی عصر (انیسویں صدی مسیحی) میں یورپ میں تاریخ نگاری، فلسفۂ اجتماعی اور سیاسی و معاشی و اقتصادی نظریات کے جدید انداز کی شکل میں یورپی EUROPEAN

سماج کے تاثرات اور ردِ عمل ظہور پذیر ہو رہے تھے جو اس سماج کی مادی، فکری اور تنظیمی استعداد و صلاحیت کی برتری کا ایک پہلو یا ایک مظہر تھا اور جس سے ہمارے سماج کی استعداد و صلاحیت کا کوئی بھی موازنہ و مقابلہ ہمارے لئے بہت کم ممکن رہا ہوگا اور پھر مزید برآں ہمارے سماج کا داخلی انحطاط اس وقت اور بھی سقیم تر کیفیت کا باعث رہا ہوگا۔ ہمارے ادب کے ان تینوں نامور اور نابغِ عصر اس وقت ان ہی دو طرفہ اجتماعی و سیاسی ناگہانی سے دوچار تھے۔ بیرونی سیاسی قوت و اقتدار کا عروج ایک طرف تھا اور اندرونی اجتماعی و معاشی انحطاط و بدحالی اور اخلاقی پستی دوسری طرف۔

دلّی اور لکھنؤ کا گھٹتا ہوا سیاسی اقتدار اور دلّی کی معاشی بدحالی اور تباہی جس سے لکھنؤ بھی باوجود لٹنے کے محفوظ تھا ان کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اجنبی قوم اور تمدن کا بڑھتا ہوا اثر و اقتدار بھی اس بات کا باعث ہوا جن سے غالب و دبیر و انیس گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ اور جہاں غالب نے غزل سرائی کے پیرائے میں دلّی کے لٹنے اور اپنے سماج کی تباہی و بربادی کا ماتم کیا۔ وہاں دبیر و انیس نے لکھنؤ کی شاہی (اودھ کی شاہی) پہ برطانوی قوت اقتدار کا دباؤ محسوس کر کے مرثیہ نگاری میں رزم نگاری کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کی ہمت بڑھائی اور ذوقِ جہاد اور منزلتِ شہادت کی عظمت ان پر واضح کر کے ان میں غیرت اور خود داری کے جذبات کو ابھارنے کی سعی کی۔ ساتھ ساتھ انیس و دبیر سے ان کے سماج کی وہ بنیادی کمزوری بھی پوشیدہ نہ تھی جو مالدار اور نادار طبقوں کے منافی عدل و انصاف تفاوت کی حقیقت اور مالداروں کی عیش پرستی میں انہیں اپنے گرد و پیش نظر آتی تھی؛ لکھنؤ کے ان دونوں مرثیہ نگار شعرا پر اس تلخ اور مکروہ حقیقت کا بہت گہرا اثر ہوا ہوگا چنانچہ ان کا تاثر ان کے اس تخلیقی ادبی ردِ عمل کی شکل میں نمودار ہوا جو ہمیں جا بجا ان کے مراثی میں اخلاقی اور اصلاحی اندازِ شاعری یا نفسیاتی اور روحانی و ذہنی طرزِ بیان و سخنوری میں ملتا ہے اور جس میں ان کا روحانی و اجتماعی اور انسانی و اخلاقی پیامِ فکر و عمل مضمر ہے۔

گو کہ غالب کی غزل سرائی ان کے کلام کی جان ہے لیکن اس سلسلۂ مطالعہ و بحث میں ان کے کلام کی دوسری اصناف کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ان کی ادبی فکر اور شعری تخلیقات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جا سکے۔ اسی طرح گو کہ انیس و دبیر کی شاعری کا سب سے اہم حصہ ان کے مراثی میں پایا جاتا ہے لیکن ان کے کلام کی دوسری اصناف مثلاً رباعی و سلام یا غزل و قطعات وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کلامِ غالب کی امتیازی خصوصیات، اس مقالے کے ابتدائی تجزیہ و تحلیل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی مخصوص زبان اور بندشیں، ان کے اندازِ بیان اور جذبات نگاری و فطرت شناسی کا ہنرکارانہ ابداع اور ان کی فکر و نظر کے فلسفہ و تصوف کے حسین و جمیل امتزاج میں نظر آتی ہیں۔ زبان اور بندشوں کے اعتبار سے غالب کے ابتدائی کلام میں فارسی کا بہت گہرا اثر ملتا ہے۔ جو متوسط اور آخر عہد تک انوکھی ترکیبوں کے ساتھ بے ساختہ روزمرہ کی اردو میں گھل مل کر ایک عجیب و غریب اور بے نظیر طرزِ بیان بن گیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے ابتدائی کلام میں یہ زبان و بندش کی خوبیاں موجود ہی نہیں

بلکہ محض یہ کہ یہ خوبیاں جو ان میں ان کی فطری ذاتی صلاحیت و استعداد کی بدولت شروع ہی سے موجود تھیں مشق کے ساتھ ساتھ روز بروز نکھرتی چلی گئیں۔ اس بات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان کے وہ اردو میں دو قصائد جو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں انہوں نے نظم کئے ہیں جن کے مطلع حسب ذیل ہیں۔

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار　　　سایۂ لالۂ بیداغ سویدائے بہار

اور　دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں　　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ان کے ابتدائی عہد شاعری کے ہیں (ملاحظہ ہو" دیوان غالب: نسخۂ عرشی" صفحہ ۳۱۰) گو کہ ان دونوں قصائد میں غالب کی زبان اور بندشیں گہرے فارسی اثرات کی آئینہ داری کرتی ہیں لیکن پھر بھی ان میں اردو زبان کا پورا پورا مزہ ملتا ہے اور ان اشعار کی بیساختگی اور تازگی پوری طرح برقرار رہتی ہے اور کسی طرح کی آورد اور تصنع کا احساس مطلقاً نہیں ہوتا ساتھ ہی ساتھ ان اشعار میں غالب کی وہ امتیازی اور انفرادی خصوصیات بھی موجود ہیں جو غالب کے سوا کسی اور کو زیب نہیں دیتیں۔ اور اس مخصوص انداز بیان میں کوئی بھی ان کی نقل بغیر خود اپنا منہ لگائے نہ کر سکا اور اسی سلسلۂ ذکر میں کلام غالب کے کلام کی جان ان کا اجمال و ایجاز جو اپنے اندر ایک بے کراں عالمِ تصور و تخیل سمیٹے ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا ایجاز ان کے تخلیقی عمل اور فنی و ادبی شاہکاروں کا اعجاز ہے جو ان ہی سے ممکن تھا اور جس کسی دوسرے نے اس انداز کو اپنانے کی سعی کی۔ اسے آخر کار اپنے عجز کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس سلسلۂ ذکر میں بھی علاوہ غالب کی بے مثل و بے نظیر غزلوں کے متذکرۂ بالا دو قصائد بھی قابل توجہ مثالیں ہیں۔ ان کا ہر مصرع ایجاز اور بلاغت کے ساتھ ساتھ سلاست کا اعلیٰ نمونہ ہے اور پھر اس دوسری امتیازی خصوصیت یعنی انداز بیان کا اجمال و ایجاز جو اپنے اندر تصور و تخیل اور تفکر و تعقل کے بے کراں امکانات سمیٹے ہوتا ہے۔ اسی سے کلام غالب کی تیسری خصوصیت اگتی ابھرتی ہوئی نظر آتی" ہے یعنی ان کی فکر و نظر اور تخیل و تعقل کے فلسفہ و تصوف کا حسین و جمیل امتزاج بھی پایا جاتا ہے اور خاص کر دوسرا قصیدہ جس کا

مطلع　دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں　　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس میں ایک عجیب و غریب درد و گداز بھی ملتا ہے اور ایسا درد و گداز جو کلام میر کے درد و گداز کے ساتھ ساتھ ایک طرف فلسفیانہ رخ رکھتا ہے اور دوسری طرف تصوف کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب کا ایک ایک شعر غالب کے مخصوص انداز میں شوخی و ظرافت و طنز و ہجو ملیح کا انوکھا پن لئے ہے جسے ممکن ہے انگریزی کے کلمہ "سینسزم" (CYNICISM) سے تعبیر کیا جا سکے۔ لیکن غالب کے "سینسزم" (جسے اردو کی جدید وضع کی ہوئی اصطلاح میں "کلبیت" بھی کہتے ہیں) میں جو خاص بات ہے وہ یہ ہے کہ منفی کیفیت کے بجائے مثبت کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور اس قصیدے کے پڑھنے میں یہ احساس بہت واضح طور پر پیدا ہوتا ہے اور یہ شاید اس لئے کہ غالب کی "سینسزم" (یا کلبیت) کے پردے میں ایک گہرا عقیدہ و یقین بھی موجود ہے یہاں تک کہ

درحقیقت اسے "سینیسزم" کہنا غلط معلوم ہوتا ہے چونکہ دراصل یہ مخصوص سینیسزم ایک تخریبی نہیں بلکہ تعمیری، منفی نہیں بلکہ مثبت قسم کے طنز و تعریض کی غرض سے بروئے کار لایا گیا ہے۔ غالب اس "کلبیت" کے خود قائل نہیں معلوم ہوتے بلکہ دنیا کی بے ہنگام روش و رفتارِ زمان کی اس تلخ نوائی کا سبب ہے اور اسی پردہ اس انداز میں نکتہ چینی کرتے ہیں جو ان کے ایک اور شعر (جو غزل کا شعر ہے) کی یاد دلاتا ہے:

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

اگر غور کیجئے تو زیرِ بحث قصیدے ("دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں") کی تشبیب میں جو ظاہری "سینیسزم" (یا "کلبیت") ہے وہ محض اپنے سماج کی برائیوں اور اجتماعی و معاشی و سیاسی حالات کی خرابیوں سے بیزاری اور شکایت کا اظہار ہے ورنہ خود مطلع اور تشبیب کے بعد مدحِ علیؑ ابن ابی طالب کے اشعار میں جو عقیدت اور یقین جو روحانیت اور تصوف ہے وہ خود پوری پوری طرح "کلبیت" کی منفیت کی نفی کر کے مثبت کا اثبات ہے۔

مطلع: "دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں"

ایک معروف نظریۂ تصوف متعلق تخلیقِ کائنات کو بہت جمیل و جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد نو شعر تشبیب کے ہیں اور پھر مدحِ علیؑ ابن ابی طالب میں جو اشعار ہیں وہ ایمان اور عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن مطلع اور مدح کے درمیان جو تشبیب کے نو اشعار ہیں وہ فلسفہ و حکمت کے نکات کو ایک ایسے انوکھے تعریضی انداز میں پیش کرتے ہیں کہ تصوف اور ایمان کی عقیدت اور تیقن کے مابین فلسفہ و حکمت کے تشکک اور معقولیت و معروضیت سے ایک ایسا دلچسپ تضاد صورت پذیر ہوتا ہے جو وجود اور زندگی، حیاتِ بشری و مجتمعِ انسانی سب ہی کے تضادات کی حقیقت کی ایک حیرت انگیز تصویر کشی کر دیتا ہے اور ان تمام تلخیوں میں جن کا تذکرہ تشبیب کے نو اشعار میں غالب نے کیا ہے شاید سب سے تلخ حقیقت وجود وہ انسانی اور اجتماعی دکھ درد ہے جس کی طرف اس شعر میں بڑے مؤثر انداز میں اشارہ کیا ہے۔

"کوہکن گرسنہ مزدورِ طربگاہِ رقیب بیستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں"

غالب کے فارسی کلام میں بہت سے اسی طرح کے اشعار ملتے ہیں جو زندگی کے عبرت انگیز تضادات کو ظاہر کرنے میں فنی اور ادبی تخلیق کے بہترین نمونے ہیں۔ لیکن اس مختصر مضمون میں ان سب کا حوالہ و تذکرہ بیجا ہوگا۔ ان سے بحث اس کے قبل بعض مقالوں میں میں نے کی ہے (مثلاً "غالب اور ان کا عہد" جو صد سالہ یادگارِ غالب کی مناسبت سے لکھا تھا)

اپنے سماج کی زبوں حالی اور اہلِ ہند کے برطانوی استعمار (سامراج) کے مقابلے میں سیاسی زوال یقیناً غالب کے دل کو اسی طرح برماتا ہوگا جس طرح ان کے پیش رو میر تقی میر کے دل کو دکھاتا تھا یا ان کے ہمعصر میر انیس کے دل کو رلاتا تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ غالب نہ تو میر کی طرح محض جذبات کے شاعر تھے اور نہ انیس کی طرح ان میں خالص عقیدت کا ولولہ و جوش تھا بلکہ ان میں ان سب کے ساتھ ساتھ فلسفہ و تصوف کی ایک ایسی پر از حکمت بے نیازی بھی تھی جو ان کو ایسے تمام

دل شکن حالات کو تھوڑی بہت معروضیت کے ساتھ دیکھنے پر مائل کر دیتی تھی چنانچہ ان کے میزانِ فکر و عمل میں فکر کا پلا عمل کے پلّے سے ذرا زیادہ بھاری تھا۔ اسی فلسفیانہ فکر نے ان میں شاید وہ "سینیسزم" پیدا کر دیا ہو جس نے ان سے یہ کہلوایا تھا کہ "شہد کی مکھی نہ ہو بلکہ مصری کی مکھی ہو" اور ساتھ ہی ساتھ وہ معروضیت اور حقیقت بینی بھی پیدا کر دی ہو جس نے ان پر یہ واضح کر دیا تھا کہ برطانوی تسلّط سے مزید ٹکّر لینا تو در کنار اس نئی قوت سے مصالحت بلکہ تعاون تک کرنا مناسب سمجھنا چاہیئے اور نتیجتاً انہوں نے جہاں اور مقتدر ہستیوں کی مدح سرائی میں قصیدہ خوانی کی مثلاً بہادر شاہ ظفر آخری مغل شہنشاہ دلّی اور نواب کلب علی خاں، والیٔ رامپور، وہاں برطانوی تسلّط کے بعد ملکہ وکٹوریہ اور دیگر مقتدر برطانوی شخصیات کی تعریف میں بمجبوری قصائد نظم کئے۔ ظاہر میں یہ سب کیا لیکن ان کا دل یہ جانتا تھا کہ گو کہ "مصری کی مکھی" بنے بغیر زندگی ایک مصیبت بن سکتی تھی اور اس لئے خوشامد بھی کرنا ضروری تھی لیکن خود بقول ان ہی کے :

" جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز ہم محک تو زر ندید ہم زرِ من محک نخواست"

اور پھر یہ سب جاننے سمجھنے اور کہنے کے باوجود وہ خود اپنی اس بلند خیالی اور عالی فکری پر عمل نہ کر سکے اور اہلِ جاہ کے سامنے باوجود اپنے علم کے وہ چاہے بصد کراہت رہا ہو، انہیں جھکنا پڑا۔ یہ ان کے حالات اور حالات کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا تضاد تھا جس سے وہ خود بے خبر نہ تھے بلکہ اپنی فطری ذہانت کے سبب سے بخوبی آگاہ تھے اور اپنی شوخیٔ مزاج کی بنا پر اس تضاد و تناقض پر انہیں ہنسنا بھی آتا تھا ! یقیناً ایسی شخصیت نہایت دلچسپ اور باغ و بہار شخصیت رہی ہو گی! اس معاملے میں ان کا انیسؔ سے موازنہ اس لئے انصاف کے منافی ہو گا۔ چونکہ ایک تو دلّی اور لکھنؤ کے حالات کا فرق نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں دلّی تباہ و برباد ہوئی وہاں لکھنؤ نسبتاً ایسی تباہی و بربادی سے بچا رہا اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ غالبؔ ایک شوخ طبع فلسفی مزاج کے شاعر تھے اور انیسؔ بہت متین طبع روحانی و اخلاقی طرز کے شاعر تھے۔

اب دبیرؔ و انیسؔ اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی طرف آیئے۔ انیسؔ و دبیرؔ میں اس قدر ادبی و فنی مماثلت و مساوات ہے کہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان دونوں مرثیہ نگاروں میں کس کے کلام کو برتری حاصل ہے۔ اگر انیسؔ کے مراثی پڑھ کر یہ خیال آتا ہے کہ اس کے بعد اب کوئی کیا کہہ سکتا ہے تو دبیرؔ کے مراثی کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ہاں اگر کوئی اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ہمت کر سکتا تھا تو بدرجۂ اولیٰ دبیر ہی کا یہ حق تھا اور پھر دبیرؔ کی مضمون آفرینی دیکھنے کے بعد اگر یہ خیال آتا ہے کہ اب اس کے بعد کس کی مجال ہے کہ مرثیہ لکھنے کے لئے قلم اٹھائے تو انیسؔ کے مراثی یہ ثابت کرتے ہیں کہ باوجودیکہ دبیر نے اس صنف کو اس کی انتہا تک پہنچا دیا، مرثیہ نگاری کے حدود کی پھر بھی کوئی انتہا نہیں ! لیکن اگر محض وقت اور صفحات کی گنجائش کے محدود ہونے کی وجہ سے مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ اس عہد کے تین ہمعصر نام اور شعرا انہیں سے جو منزلتِ شعر و فن اور درجۂ ادب میں ایک دوسرے کے ہم پایہ تھے، ایک دبستانِ دلّی اور ایک دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ بغرضِ بحث و موازنہ سامنے لایا جائے تو پھر شاید یہ غلط نہ ہو کہ اگر ادبی و فنی جامعیت و کمال کے اعتبار سے دلّی کی طرف سے غالبؔ کو پیش کیا جائے تو پھر

لکھنؤ کی طرف سے انیس کو پیش کرنا شاید زیادہ مناسب ہو۔ لہٰذا اس سلسلۂ بحث میں اس کے بعد انیس کے کلام سے اسی طرح بحث کی سعی کی جائے گی۔ جس طرح غالب کے کلام سے کی جا چکی ہے۔

غالب کے کلام میں اس کے عہد اور سماج کا جو عکس نظر آتا ہے اس کی نوعیت جھلکیوں جیسی ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب دراصل غزل سرا شاعر تھے اور غزل کے ظرف کا پھیلاؤ باوجود اس کی تمام جذباتی اور فکری گہرائیوں کے محدود ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ ایجاز و اجمال کی جامعیت اور جمال غزل سرائی کی جان ہوتی ہے لیکن غزل میں تفاصیل و تشریحات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ خود غالب نے بھی اس گھٹن کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بقدر ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے"

ظاہر ہے کہ واقعہ نگاری اور بیانیہ شاعری کی تفاصیل اور تشریحات کی نہ تو غزل میں گنجائش ہوتی ہے نہ وہ غزل کے لئے مناسب ہوتی ہیں اور جو غزل کا عالم ہے وہی رباعی کی صنف کا بھی عالم ہے۔ رباعی میں بھی غزل کی طرح ایجاز و اجمال کی جامعیت و جمال اس کی جان ہے۔ چنانچہ غزل میں حافظ اور رباعی میں خیام کے کمال اور سرمدی تازگی کا یہی راز ہے۔

برخلاف اس کے نظم مسلسل کی واقعہ نگاری ہو یا بیانیہ تفصیل و توصیف اس میں خود شاعر کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے اور جو کچھ اس کے ذہن میں وارد ہوتا ہے کہہ جاتا ہے اور بالعموم پڑھنے یا سننے والوں کے لئے اس میں اپنی طرف سے تعبیر کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس میں پھیلاؤ تو بہت کم ملتا ہے لیکن کمی اور اکہری کے امتزاج کی گہرائی نہیں محسوس ہوتی۔ اگر رباعی اور غزل کی مثال ایک ایسے افسانوں اور کہانیوں والے تال کی سی ہے جس کا پھیلاؤ تو بہت کم ہوتا ہے لیکن اس کی تھاہ نہیں ملتی اور جس کی اتھاہ گہرائیوں سے عجیب و غریب پُراسرار مخلوق ابھرتی رہتی ہے تو نظم مسلسل کی بیانیہ شاعری اور واقعہ نگاری کی مثال ایک بے کراں سطح آبی کی سی ہے جس کا پھیلاؤ بے حد و انتہا ہو لیکن اس کے صاف اور شفاف پانی میں اس کی تہہ بالکل قریب نظر آتی ہو۔ مجملاً مسئلہ یہ ہے کہ انفرادی ذہن کی استعداد و صلاحیت باوجود تمام امکاناتِ تعمق و انتشار کے محدود ضرور ہوتی ہے۔ چونکہ وقت اور زندگی بھی انفرادی طور پر محدود ہوتی ہے۔ اگر پھیلاؤ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو گہرائی میں کمی رہ جاتی ہے اور اگر گہرائی کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو پھیلاؤ میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ شعرا اور اہل قلم کی تو یہ مشکلات ہیں لیکن ہم ایسے نکتہ چینوں اور ناقدوں کی توقعات بھلا کب کم ہوتی ہیں۔ بقول انیس

"غلط یہ لفظ، وہ بندش بری، یہ مضموں سست ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو"

انیس جو مرثیہ سرا شاعر تھے، برخلاف غالب، اپنی مسلسل اور بیانیہ صنف نظم میں یعنی مرثیے کی وہ مخصوص شکل جو سودا اور پھر دلگیر اور فصیح اور ضمیر اور خلیق کے ہاتھوں ترقی کر کے انیس و دبیر کے قلم سے اپنی ارتقائی شکل تک پہنچ چکی تھی، بہت مفصل تصویر کشی کر گئے ہیں اور ان کے کلام میں ہمیں اکثر ان کے عہد اور سماج کی محض جھلکیاں ہی نہیں بلکہ پوری پوری جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان تصویروں کی گہرائی یا پس منظر میں انیس کے روحانی و اخلاقی

اور انسانی و اجتماعی تصورات بھی نظر آتے ہیں جو اپنے اندر نہ محض خود ان کے ذاتی عقائد اور خیالات کو لئے ہوئے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان تاریخی اسلامی روایات اور ان پر مبنی اقدار و قیم کا جلوہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ اور خود انیس کے گرد و پیش سماجی حالات اور امور اور ان سے متعلق مقامی ثقافت و تہذیب کی جھلک بھی برابر دکھائی دیتی ہے اور اسی وجہ سے انیس کے مراثی کا پھیلاؤ بے حد بے انتہا معلوم ہوتا ہے اور اس طرح ان کے مراثی میں ان کے عہد اور سماج کے وہ تضادات اور تناقضات بھی بخوبی واضح ہو جاتے ہیں جو علی الخصوص اس متفندا اور ثروت مند طبقۂ امرا و رؤسا میں علی العموم موجود تھے جو امراء و رؤسا اعلیٰ انسانی اقدار و قیم اور اخلاق حسنہ پر زبانی اعتقاد رکھتے ہوئے بھی ایک بیشتر زر دار سماج میں رہ کر داد عیش دینے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتے تھے اور جن کی بے حسی پر انیس نے اپنی مرثیہ سرائی کے ضمن میں بلاواسطہ بھی اور بالواسطہ بھی کڑی تنقید کی ہے۔ لیجئے انیس کے ایک سلام کا شعر ملاحظہ ہو۔

"دہانِ کیسۂ زر بند رکھ پرائے منعم خدا کے واسطے واکر جبیں کی چینوں کو"

اسی تجزیہ و تحلیل و تقسیم کے مطابق جو شروع میں پیش کی گئی انیس کی شاعری کے بھی یہی تینوں ممتاز خصوصیات قابل توجہ ہیں۔

(۱) سلاستِ زبان کے سلسلے میں انیس کی شاعری پر اتنا کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اس پر مزید اور کیا لکھا جائے علاوہ یہ کہ حالی و آزاد و شبلی سے لے کر عہدِ حاضر کے اہلِ قلم تک تقریباً سب ہی نے کلامِ انیس کے اس پہلو پر کچھ ضرور لکھا ہے۔ اور اس کے متعلق اپنے اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ اور مخصوص معیار اور ذوق کے مطابق اسے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اکثر و بیشتر نے اپنی اپنی رائے میں اس کے محاسن کا اعتراف ضرور کیا ہے۔ انیس کے طرزِ بیان کی آمد، برجستگی اور بے ساختگی اور ان کی زبان کی سلاست اور روانی سہل ممتنع کی بہترین مسلسل مثالیں قائم کرتی چلی جاتی ہے اور مکالمہ و محاکات میں یہ خصوصیت اور بھی زیادہ چمک اٹھتی ہے۔ انیس کا یہ کہنا کہ

"مری قدر کر لے زمینِ سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا"

تعلّی نہیں بلکہ بیانِ حقیقت تھا۔

(۲) انیس کا کلام حسن و کمالِ فطرت نگاری میں آپ اپنی مثال ہے جس میں نفسیاتی نکات، منظر نگاری، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، بہار اور خزاں کی تصویر کشی، گرمی کا بیان، دریا کا بہاؤ۔ لُو کے تھپیڑوں کی شدت اور ٹھنڈی ہوا کی موجوں کی جاں فزا کیفیت، منظرِ طلوع و غروب کا جمال، اور رخصت کے بعد جنگ و شہادت کا جلال اور عظمت ان سب مختلف فطری کیفیات اور حالات نے ایسی حقیقی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس قدر شاعرانہ خوبیوں سے سنور کر مناسب جگہ پائی ہے کہ کم از کم اردو میں تو ان کے قبل یا ان کے بعد کوئی ان سب کو یکجا کر کے ہم آہنگ کرنے میں ان کی طرح کامیاب نہیں ہوا۔

(۳) جہاں مذکرہ بالا دونوں ممتاز خصوصیات کلامِ انیس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے وہاں ان کے کلام کی تیسری ممتاز خصوصیت یعنی کلامِ انیس کے اخلاقی و اصلاحی پیام کی نوعیت و اہمیت نسبتاً اب بھی تشنۂ توضیح و تعبیر معلوم ہوتی ہے اور اس کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں کی گئی حالانکہ شاید کلامِ انیس کا یہ پہلو سب سے زیادہ دلچسپ اور اہم معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں قدیم اسلامی اقدار و قیم اور قدیم تر اودھ کی مقامی روایات و رسوم کے ساتھ ساتھ خود انیس کے عہد اور سماج کی ثقافت و تہذیب کا ایک ایسا انوکھا امتزاج موجود ہے جو لکھنؤ کی ایک جیتی جاگتی تاریخی یادگار بن کر مراثی انیس میں جب تک اردو زندہ و پائندہ ہے ہمارے مطالعہ و بحث و تحلیل و توضیح و توجیہ کے لئے موجود رہے گا۔ اگر لکھنؤ کی اس رچی ہوئی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ منظور ہے جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ماضی کی تاریخ بن چکی ہے (گو کہ ہم میں سے اب بھی بہت ایسے ہیں جنہوں نے اس میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی) تو وہ تمام و کمال جمال و جامعیت ہمیں بس مراثی انیس و دبیر ہی میں ملے گی اور اس کا لکھنؤ کی غزل سرائی میں تلاش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے بعض پیسے والے سیاح دنیا کے محض بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کے بعد جہان دیدہ (دنیا دیکھے ہوئے) ہونے کا جھوٹا اور خود فریب ادعا کرتے ہیں۔

انیس اور دبیر کے مراثی میں ایک طرف مقامی رنگ اور دوسری طرف تاریخی روایات اور اقدار و قیم کا پس منظر مل جل کر ایک بہت اعلیٰ انسانی پیام پیش کرتے ہیں اور اس کا یہی سبب ہے کہ انیس و دبیر نے اپنے اندازِ کلام میں ایک مشترک مقصد ہمیشہ مدنظر رکھا۔ اور وہ ثروت مند طبقے کی تنقید کے ذریعے اصلاح اور حاجت مند طبقے کی حمایت سے متعلق تھا۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ ناداروں کو انہوں نے خودداری اور انسانی وقار اور عزتِ نفس و مناعتِ طبع کا احساس و شعور بھی دلایا جیسا مثلاً انیس کے مذکورہ بالا شعر سے ثابت ہوتا ہے اور انیس کے اسی طرح کے دوسرے اشعار سے بھی مترشح ہوتا ہے۔ مثلاً

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے — سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے ہیں

انیس نے اردو ادب کو نہ محض مرثیہ سرائی کی صورت میں نظمِ مسلسل کی بیانیہ شاعری اور تفصیل سے مالا مال کیا بلکہ وہ سلام کے اشعار اور رباعیات کی شکل میں اجمال و ایجاز کے ادبی و فنی حسن و جمال و جامعیت کا بھی گرانمایہ ذخیرہ وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے اور علاوہ دوسرے مضامین و موضوعات کے جن کی فہرست طویل ہے انہوں نے اجتماعی مسائل اور مختلف سماجی معاملات پر بھی بہت سی رباعیاں نظم کیں جن کی دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں جو زیرِ بحث موضوع سے متعلق ہیں ۔

(۱)

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں — یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ ساغر استغنا سے — آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

(۲)

دولت نہ عطا کر نہ جہاں میں زر دے جو باعثِ آبرو ہو وہ گوہر دے
شاہوں کو نصیبِ سحر و بر کی تحصیل یارب مجھے نانِ خشک و چشمِ تر دے

(۳)

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے غفلت نہیں طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

(۴)

عزت رہے یاروآشنا کے آگے محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں چلیں یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

مندرجہ بالا رباعیات میں بھی جو انسانی وقار اور خود داری کے ساتھ ساتھ ایک انسانی ہمدردی کا گہرا جذبہ اور دل خستگی و دل گداختگی کا انداز محسوس ہوتا ہے۔ وہ لکھنؤ کی اس رچی ہوئی ثقافت و تہذیب کا نہ محض آئینہ دار ہے بلکہ اسے قائم رکھنے والا اور ترقی دینے والا بھی تھا اور اس اعتبار سے انیس کا درجہ محض ایک شاعر کا درجہ نہیں رہتا بلکہ اپنے سماج میں انہیں ثقافت و تہذیب کے قائد اور مصلح کا درجہ بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

انیس کی شاعری اور ان کی زندگی کے اصول اور کردار میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ ان کے کلام میں جو جو کردار کی خوبیاں اور اخلاق حسنہ کی تعریفیں ملتی ہیں وہ سب کم و بیش ان کی زندگی اور کردار میں بھی ہمیں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انیس کی خودداری اور ان کی نظر میں جو انسانی وقار کی اہمیت تھی اور ساتھ ساتھ جو انسانی ہمدردی اور حسنِ اخلاق ان میں پایا جاتا تھا۔ وہ ان کے اس کلام کا پرتو تھا۔ انہوں نے انسانیت کی بلند و بزرگ و برتر ہستیوں کی مدح سرائی اور مرثیہ سرائی میں نظم کہا تھا۔ انیس نے نہ تو کسی دنیاوی صاحب جبروت و اقتدار یا بادشاہ و سلطان یا حاکم و امیر کی مدح کی اور اس کے در پر حاضری دی۔ ان کی خودداری کا اتنا چرچا ہوگیا تھا کہ قبلِ جنگ آزادی (۱۸۵۷-۵۸ء) نہ تو شاہانِ اودھ نے ان سے خوشامد اور قصیدہ خوانی کی خواہش کرنے کی جرأت کی اور نہ بعد جنگ آزادی عظیم آباد اور حیدرآباد دکن کے کسی امیر و رئیس یا حاکم و سلطان نے ایسی جسارت کی بلکہ یہ سب ان کے سامنے باادب رہنا ہی مناسب تر سمجھتے رہے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ ذی علم ذی ہنر ذی وقار سید جان دے دے گا مگر عزت کا سودا کبھی نہ کرے گا چنانچہ اگر وہ میر صاحب کی خدمت میں کوئی ہدیہ بھی پیش کرنا چاہتے تھے تو اس میں بھی میر صاحب کے وقار و منزلت اور ان کی نازک مزاجی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی بہت مناسب اور محتاط طریقہ اختیار کرتے ورنہ میر صاحب اسے ٹھکرا دیتے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ غریب سید اپنے ادبی کمال اور انسانی وقار کی قدر و قیمت کو بازار کے بھاؤ کے مطابق گرانے کو کبھی تیار نہ ہوگا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ بمصداق شعر حافظ

میر انیس وہ ہیں کہ ؎

فقیر میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

اور جب میر انیسؔ زیب منبر ہوتے تھے تو اس وقت ان کی نگاہوں سے بڑے سے بڑے سلاطین و جبابرۂ روزگار کے تخت گر جاتے تھے اور وہ ان کی کوئی بھی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس کی طرف میرے نانا مرحوم محمد علی محمد متخلص بہ محبؔ یوں اشارہ کر گئے ہیں (اور یہ یاد رہے کہ میرے نانا گو کہ خود اپنے گھر کے رئیس و امیر تھے لیکن ان کی تربیت و تعلیم لکھنؤ کے اس دلبستان شاعری میں ہوئی تھی جو انیسؔ و دبیرؔ نے قائم کیا تھا اور انیسؔ ہی کے گھر سے انہیں شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا)

"کیوں جھکیں شاہانِ عالم سے ثنا خوانِ علیؑ تختِ شاہی میں صفت کیا ہے جو منبر میں نہیں"

تو یہ انیسؔ و دبیرؔ ہی کی مرثیہ سرائی اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مدح سرائی کا فیض تھا جس نے ہمارے اس لکھنؤ کو جو دیکھتے دیکھتے آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا وہ ثقافت و تہذیب عطا کی تھی جس میں انسانی وقار اور انسانی ہمدردی کے جذبات و احساسات ہم آہنگ ہو کر کارفرما رہتے تھے۔

اب اگر یہ دیکھنا ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کی مرثیہ سرائی نے کس طرح اس تہذیب و ثقافت کو ارتقا دے کر قائم رکھا تو ان کے مراثی کا بغور مطالعہ کیجئے لیکن آج کل کی ہوا و ہوس زر میں اب کسے ٹھہرنے کا اور دم لینے کا موقع ملتا ہے۔ اور اس مقالے کی وسعت اتنی کہاں سے ہو سکتی ہے کہ ان مراثی کے اس اہم پہلو پر کما حقہ روشنی ڈالی جائے البتہ محض حوالے اور اشارات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اور مزید برآں مقالے کا اختصار اس پر مجبور کرتا ہے کہ دونوں عظیم شاعروں میں سے ایک ہی کے مراثی کے متعلق کچھ اجمالاً کہہ دیا جائے لہٰذا دیکھئے کہ میر انیسؔ کے مراثی میں اس اہم پہلو سے متعلق کیا کیا ملتا ہے۔

انیسؔ کو اپنے سماج کی ناانصافیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا تھا اور خود ثروت مند اور مقتدر طبقہ امراء و رؤساء کو بھی متوجہ کر کے شرم دلانا تھی چنانچہ ان کے تقریباً سب مراثی میں جو ایک امرِ مشترک ہے وہ حسینیت کی غربت کے ساتھ حقانیت اور یزیدیت کی امارت و ثروت کے ساتھ شرارت ہے۔ اگر یزیدی فوج میں طبل و نشان دکھائی دیتے ہیں اور ڈنکے پر چوٹ پڑتی اور نغمات اور شراب و کباب کا دور دورہ ہے تو حسینی جماعت میں محض ایک علم، علمِ رسولِ اسلام ہے۔ فاقہ اور پیاس ہے اور صدائے اذان ہے اور اگر یزید کے حامیوں کی طرف ایک جمِ غفیر ہے جو سونے اور چاندی کی لالچ میں ضمیر بھی بیچ چکا ہے یا جہالت کے اندھیرے میں اپنے داہنے اور بائیں ہاتھ میں بھی تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو حسینؑ کے جان نثاروں کی قلیل تعداد میں ہر ایک اصول عدل و حق و انصاف پر مرنے کے لئے آمادہ ہے اور ان کے چہرے ان کی پیشانیاں اور ان کے دل اور سینے معرفت کے نور سے معمور ہیں۔ اگر یزید کی طرف شاہی استبداد و جبروت ہے تو حسین ابن علیؑ کی طرف باوجود تنہائی حق کا

نہ دینے والا عزم و ہمت ہے اور اس سب سے جو مرکزی نکتہ ابھرتا ہے وہ یہی کہ عیش پرستی اور نخوت و تکبر اور ظلم و ستم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر یزیدیت منظور ہے تو انہیں باقی رکھو لیکن اگر حُر کی طرح یزیدیت چھوڑ کر حسینیت کی طرف آنا ہے تو پھر ان سب لوازم استبداد و ظلم کو چھوڑنا ہوگا۔

بطور شہود یہاں میر انیسؔ کے ایک مرثیے سے محض چند متفرق بند غیر مرتب طور سے پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ تسلسل و ترتیب سے پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مرثیے کا مطلع ہے "طے کر چکے حسینؑ جو راہِ ثواب کو"

فرمایا شہ نے خیمہ جو اللہ کی رضا (۸) موقع ہو جس جگہ وہیں خیمہ کرو بپا
آرام سے غریب مسافر کو کام کیا رہتے ہیں دھوپ میں بھی بہت بندۂ خدا
دو چار دن میں عمر کی مدت تمام ہے
میداں سے ہم غرض ہے نہ دریا سے کام ہے

زینبؑ نے جب یہ ہودج میں سے سنا کلام (۹) محمل سے یوں پکاری کلیجے کو تھام تھام
کیوں چلتے چلتے آپ نے یاں روک لی لگام بھیّا ادھر تو آؤ یہ ہے کونسا مقام
بستی بھی ہے کوئی کہ یہی ایک نہر ہے
اس دشتِ پُر خطر میں اُترنا تو قہر ہے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن (۱۶) اترو یہیں کہ خوف کی جا گہ نہیں بہن
یہ نہر علقمہ ہے یہ ہے کربلا کا بن آئے اسی کے شوق میں ہم چھوڑ کر وطن
رہنے میں اس جگہ کے ضرر کیا فقیر کا
خیمہ یہاں ہوا تھا جناب امیرؑ کا

کچھ مال و زر نہیں کہ تلف کا ہو جس کے ڈر (۱۷) یکساں ہے بے وطن کے لئے شہر و دشت و در
مسکن یہی زمین ہے یہی بے گھروں کا گھر کیا جانیں اس مقام سے ہو کس طرف سفر
انساں کو چاہیئے کہ گناہوں سے پاک ہو
شاید ہماری خاک اسی بن کی خاک ہو

گھوڑا بڑھا بڑھا کے لعینوں نے یہ کہا (۲۰) بتلاؤ کس نے حکم اترنے کا یاں دیا
ہٹ جاؤ ابن سعد کے نیچے کی ہے یہ جا ڈھونڈو کنوئیں کہیں نہیں دریا سے کام کیا
گرمی میں بند ہوئے گا پانی امام پر
ہوگا نہ کل ہوا کا گذر اس مقام پر

(۳۹) چھپ جائے گی سپاہ کی کثرت سے سب زمیں — موسم وہ ہے کہ اتریں گے سب نہر کے قریں
دریا بھی سوکھ جائے تو اس کا عجب نہیں — جلدی کنارہ کش ہوں کنارے سے شاہ دیں
دنیا میں آج شام کے حاکم کا زور ہے
یاں دوپہر سے شمر کے آنے کا شور ہے

(۴۰) اس کثرت سپاہ پہ تا کہ ہوئی یہ دھوم — آپہونچا شام سے پسر سعد نحس و شوم
جس کے جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم — اکثر ہیں کینہ ساز جوانان شام و روم
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بند و بست لڑائی کا ہوئے گا

(۴۱) یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں — امڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بے کراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں — لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادباں
ہلتا تھا دشت یوں دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

(۴۲) جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل — خوف خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہل نار و دغاباز پر دغل — شکلیں مہیب دیو سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہ خاندان رسالت پناہ تھے
ایسے چلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

(۴۳) تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار — غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دم بدم تھی صدا آسماں کے پار — آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسان شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

(۴۴) اترا قریب خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر — سر پہ لگایا دوڑ کے خادم نے چتر زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر — بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر
خیمہ ہے کس طرف کو شہ خوشخصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

(۴۵)

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر — آئے تھے یاں اترنے کی خاطر امامِ دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر — ہم نے اٹھا دیا انہیں لیکن بجبر و قہر

عباس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیر پھیر لے گئے، سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاری حسین (۴۶) راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
پھوپی علی کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین — آفت میں مبتلا ہے محمد کا نورِ عین

بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ امم (۴۷) سنتے تھے واں سپاہِ حسینی کی دھوم ہم
اس نے کہا حسین کے یاور بہت ہیں کم — فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم

ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکاسی جوان ہیں

ہے اک علم یہ قلتِ لشکر کا ہے نشاں (۴۸) یہ حال ہے لٹا ہوا جیسے ہو کارواں
اردو میں جنس غم کے سوا جنس ہے گراں — غلہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحطِ آب و ناں

اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل ستر تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

مطبخ ہے سرد آگ کا اس میں نہیں ہے نام (۴۹) بچے ہوائے گرم سے بے تاب ہیں تمام
خاک آبدار خانے میں اڑتی ہے صبح و شام — کیونکر رہیں گے بیکس و مظلوم تشنہ کام

یاں سینکڑوں کمانیں ہیں فوجِ امیر میں
دو دو گریں گے خاک پہ ایک ایک تیر میں

بتیس سب سوار شہ دیں کے پاس ہیں (۵۰) اب رہ گئے پیادے سو وہ کم پچاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر با حواس ہیں — غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں

کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
بس ہے یہی اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے ۴۴

سید سردار مہدی رضوی

از کلام خدائے سخن میر انیس

زبان اردو کے جتنے مستند شاعر گذرے ہیں۔ ان کی شہرت صرف چند صنف شاعری میں ہوئی ہے لیکن میر انیس علیہ الرحمۃ کے کلام میں تمام اصناف شاعری پائے جاتے ہیں۔ مثلاً غزل، قطعات، سلام، مرثیے اور نوحے وغیرہ۔

قارئین رسالۂ "پیام عمل" کی خدمت میں اس مرثیے کے صرف اٹھارہ بند پیش کر رہا ہوں جو میر انیس نے ۲۸ رجب سنہ ۶۰ھ کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے مدینہ منورہ سے سفر غربت اختیار فرمانے کے حال میں نظم فرمایا ہے۔ یہ میر انیس کا شاہکار ہے۔ مرثیہ نگار شاعروں نے اس حال میں بہت سے مرثیے نظم فرمائے ہیں لیکن میر صاحب کا یہ مرثیہ جذبات انسانی کا بے نظیر مرقع ہے۔ بھائی، بہن، ماں، بیٹی کے خصوصی جذبات کا یہ مرثیہ آئینہ دار ہے۔

فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے   سادات کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے

۴۴

بولا وہ تب کہ ہوں گے جواں یاں کے کے ہزار   (۵۵) خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
ہیں تین چار کوس کے گردے میں سب سوار   اک اک جواں ہے رستم میدان کارزار
کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں کہ قیامت کی موج ہے

ظاہر میں گرچہ تھے رفقائے شاہ کے قلیل   (۸۹) پیش خدا مگر وہ حقیقت میں تھے جلیل
جرأت میں بے نظیر شجاعت میں بے عدیل   سرگرم جان دینے پہ سب صورت خلیل
فاقوں میں صبر و شکر سے دل ان کے سیر تھے
جانباز تھے جری تھے مجاہد تھے شیر تھے

سر پر عمامے چاند سی پیشانیوں پہ نور   (۹۰) حاضر گلا کٹانے کو سب شاہ کے حضور
لب برگ گل سے سوکھے ہوئے پیاس کا وفور   یکتا ہر اک مگر نہ تکبر نہ کچھ غرور
پیرو امام کے تھے نکوں خوش طریق ہوں
آقا حسین سا ہو تو ایسے رفیق ہوں

درپیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بسر ہے
گل رو صفتِ غنچہ کمربستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورتِ گلدستہ کھڑے ہیں

رخصت کے لئے لوگ چلے آتے ہیں باہم ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پُرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم غل ہے کہ چلا دلبر مخدومۂ عالم
خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبرِ نبیؐ کے
روضہ پہ اداسی ہے رسولِ عربیؐ کے

تدبیرِ سفر میں ہیں اِدھر سبطِ پیمبر گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباسؑ دلاور تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبر
شہ کو جنہیں لے جانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

آراستہ ہیں بہرِ سفر سرو قبا پوش عمامے سروں پر ہیں عبائیں بسرِ دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرورؑ کے قدم پر گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر

عوراتِ مدینہ چلی آتی ہیں بصد غم کہتی ہیں یہ دن رحلتِ زہراؑ سے نہیں کم
پُرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہردم فرش اٹھتا ہے کیا کھچتی ہے گویا صفِ ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہیں زینبؑ
ہر اک کے گلے ملتی ہیں اور روتی ہیں زینبؑ

ان بی بیوں سے کہتی ہیں یہ شاہ کی ہمشیر بہنوں ہمیں یثرب سے لئے جاتی ہے تقدیر
اِس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر پیہم خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیرؑ
مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

سن کر یہ سخن مادرِ اکبرؑ یہ پکاری میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہو گئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری یہ کس کے لئے کرتے ہیں سب گریہ و زاری
اب کس پہ میں اس صاحبِ آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

سفر کے وقت حضرت امام حسینؑ کی صاحبزادی جناب فاطمہؑ صغریٰ سخت علیل تھیں اس لئے صعوبات سفر کے خیال سے انہیں ساتھ لے جانا مناسب نہ تھا۔ مزید برآں وہ اپنی دادی جناب فاطمہؑ سے حد درجہ مشابہ تھیں اس لئے انجام سفر سے واقف ہوتے ہوئے ان کا ساتھ نہ جانا ہی بہتر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مشیت ایزدی سے ہی بیمار ہوئی ہوں۔

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے — بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے لیلیٰ کا سخن لب پہ یہ لائے — کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اسکو بچائے
جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اسے لے جاؤں سفر میں

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام — جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام — دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گذر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغراؑ نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار — پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار — تبرید فقط آپ کا ہے شربت دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گذر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا

مر جاؤں گی بچھڑی جو مسیح دوسرا سے — صحت مجھے ہو جائے گی حضرت کی دعا سے
کٹ جائے گا اندوہ سفر فضل خدا سے — بیماری میں جان آئے گی جنگل کی ہوا سے
سب ساتھ ہیں روؤں گی نہ غم کھاؤں گی بابا
بیٹھی ہوئی محمل میں چلی جاؤں گی بابا

آئندہ بند میں میر انیسؔ نے جذبات کی بہترین ترجمانی کی ہے:-

وہ بات نہیں ہوگی کہ بے چین ہوں مادر — ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغرؑ — لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے خواہر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

جناب علی اکبرؑ اور جناب فاطمہؑ صغراؑ حقیقی بہن بھائی ہیں۔ ان کی فطری محبت کا اندازہ ان بندوں سے ہوتا ہے:-

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبرؑ	اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر	وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نے بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

پاس آن کے اکبرؑ نے یہ کی پیار کی تقریر	کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر؟
چلانے لگی سینہ پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر	محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

پیارے مرے بھیا مرے مہرو علیؑ اکبر	چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علیؑ اکبر
یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو علیؑ اکبر	ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمہیں ہر سو علیؑ اکبر
دل سینے میں کیوں کر تہ و بالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا

مرنا تو مقدر ہے غم اس کا نہیں زنہار	دھڑکا ہے کہ جب ہونگے عیاں موت کے آثار
قبلے کی طرف کون کرے گا رخِ بیمار	یٰسین بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غم خوار
سانس اکھڑے گی جس وقت تو فریاد کروں گی
میں ہچکیاں لے لے کے تمہیں یاد کروں گی

ماں نے کہا بس اب نہ کرو گریہ وزاری	اصغر بھی لگا رونے صدا سن کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری	آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

سب بی بیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر	سینے سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیرؑ
لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر	منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

سید اصغر حسین آصغر لکھنوی
"آلِ انیس"

تذکرۂ خانوادۂ انیس

شخصیت کو دیکھو تو کس قدر انکسار، زبان میں بلا کا لوچ، مصرعوں کی روانی جیسے دریا بہتا ہو۔ الفاظ جیسے نگینے جڑے ہوں۔ رزم یا بزم فرسِ فکر نہایت سبک روی سے مثالِ بادِ سحر گامزن ہے۔ اس مختصر سے خاکے میں جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اسے خدائے سخن میر ببر علی انیس ہی کہہ سکتے ہیں۔ میر ببر علی انیس کا نام اردو ادب میں ایک روشن باب کا اضافہ ہے جس کی تابندگی سے تمام بزمِ سخن منور ہے۔ مرثیہ جیسی طویل مشکل ترین صنفِ سخن کو اپنا کر میر صاحب نے جو مقام حاصل کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس میدان میں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ آفاقی ادب کے پیشِ نظر میر انیس کو ہر علاقے سے جو علاقہ ہے۔ اس نے میر انیس کی شخصیت کو ہمہ گیری بخش دی۔ کیونکہ ادب نہ دہلوی ہے نہ لکھنوی۔ جہاں علاقائیت ادب میں شامل ہو جائے وہیں اس کا انحطاط ضروری ہے میر انیس نے شاعری ترکے میں پائی تھی۔ باپ دادا دہلوی خود فیض آبادی بود و باش لکھنوی تھی اسی لئے میر انیس پر دونوں مکتبۂ فکر کا برابر حق ہے چنانچہ میر صاحب نے اس کا اظہار خود ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"صاحب یہ زبان میرے گھر کی ہے" اسی جملے میں جو ایک خاص پہلو پوشیدہ ہے۔ وہ دہلوی اور لکھنوی دونوں اسکولوں سے مختص ہے۔ یہ دونوں مکتبۂ فکر اس بات کے کہنے میں حق بجانب ہیں کہ میر انیس ہمارے ہیں۔ اس بارے میں مولانا الطاف حسین صاحب حالی فرماتے ہیں۔

رباعی

دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیس ۔۔۔ اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس!
دِلّی جڑ تھی تو لکھنؤ اسکی بہار ۔۔۔ دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

یہ کرشمہ میر صاحب کی اس آفاقی فکر کا ہے جس نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا اس کی مثال خود میر صاحب کا کلام ہے۔ آیئے ہم میر صاحب کو ان کے اشعار کے آئینے میں دیکھیں۔ ع

کسی نے تری طرح سے اے انیس ۔۔۔ عروسِ سخن کو سنوارا نہیں
سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر ۔۔۔ مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن ۔۔۔ تجھے بات میں آسماں کر دیا
نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیس ۔۔۔ جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار ۔۔۔ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مفتی میر محمد عباس صاحب میر انیسؔ کے لئے فرماتے ہیں کہ میں اُس کلام کی کیا تعریف کر سکتا ہوں۔ جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے اگر کتابِ الٰہی اردو میں نازل ہوتی تو میر انیسؔ کی زبان میں۔

مرزا دبیرؔ ایسے جلیل القدر شاعر انیسؔ کی وفات پر یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ؎

آسماں بے ماہِ کامل سدرہ بے رُوح الامیں   طورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیسؔ   ۱۸۷۴ء

میر انیسؔ نے بچپن سے ہی غزلیں کہنا شروع کر دی تھیں لیکن والد کے اصرار پر غزل گوئی ترک کر دی اور پوری توجہ مرثیے اور سلام کی طرف مبذول کر دی غزل کا وہ جذبہ سلام میں بھی پایا جاتا ہے اور مرثیے میں بھی، غزل میں ندرت ہے لیکن مرثیے کا رنگ اس میں بھی آگیا، غزل کا مشہور مطلع ہے۔ ؎

شہیدِ عشق ہوئے قیس نامور کی طرح   کئے جو عیب بھی ہم نے تو وہ ہُنر کی طرح

اس میں لفظِ "شہید" مرثیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اب سلام کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں دوسرا مصرعہ مکمل غزل کا ہے اور پہلا بھی ہے۔ ؎

سکینہؔ نازپرور قید کی آفت کو کیا جانے
یہ عالم ہے قفس میں جس طرح طائر پھڑکتا ہے

مرثیوں کی مقبولیت

میر انیسؔ کا کلام ان کی زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا۔ دُور دُور کے حضرات آتے تھے اور تبرک کی طرح نقلیں لے جاتے تھے مرثیے تحفے میں بھیجے جاتے تھے۔ میر انیسؔ کے انتقال کے بعد کلام کی مقبولیت اور بڑھ گئی۔ خانوادۂ انیسؔ کا ہر فرد شاعر تھا جو مقبولیت میر انیسؔ کے کلام کو ملی تقریباً وہی مقبولیت میر خورشید علی صاحب نفیسؔ مرحوم، میر علی محمد صاحب عارفؔ مرحوم اور میرے والد مرحوم سید ظفر حسین عرف بابو صاحب فائقؔ کے کلام کو حاصل تھی۔ میں نے جونپور میں ایک خاندان کو دیکھا جو انیسؔ پرست تھا مفتی محلے میں مفتی محمد باقر صاحب مرحوم کے یہاں میر انیسؔ مرحوم کے مرثیے نول کشور پریس نے شائع کئے تھے۔ میں نے قلمی خوشخط مرثیے دیکھے جو مخمل جزدانوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اس خاندان نے ایامِ عزا میں ہمیشہ انیسؔ اور خانوادہ انیسؔ کا کلام پڑھنا طرۂ امتیاز سمجھا۔

جس زمانے میں حکیم پیارے صاحب فیض آبادی نے مجھے فیض آباد بلایا اور میں نے جواہر علی خاں کے امام باڑے میں مجلسیں پڑھیں، اس زمانے میں میری عمر ۱۳ یا ۱۴ سال کی تھی۔ یہ مجلسیں دسہرے کی چھٹیوں میں ہوتی تھیں۔ ان مجالس کے بانی اہلِ فیض آباد تھے۔ تمام مشاہیر ہندوستان یہاں مجلسوں میں آنے کے بعد اپنے اپنے فن کے کمالات کا اظہار فرماتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ۱۳ سال کے سن میں تین گھنٹے مجلس پڑھی اور مجمع ہمہ تن گوش رہا۔ میں نے مرثیہ اپنے والد مرحوم کا پڑھا یہ مرثیہ والدِ مرحوم کا ہندوستان میں مقبولِ عام ہے

مطلع : آج پھر جوش پہ ہے نشۂ صہبائے سخن

اسی صورت سے میں نے جب جونپور میں مجلسیں پڑھیں تو ایک عشرہ میں نے مفتی محمد باقر صاحب مرحوم کے یہاں پڑھا یہاں کی ایک مجلس میں میں نے اپنے دادا میر علی محمد صاحب عارفؔ مرحوم کا تصنیف کردہ مرثیہ پڑھا۔ مطلع

ع رن میں افلاکِ امامت کے قمر آئے ہیں

یہ مرثیہ میں نے اپنے والد سید ظفر حسین صاحب فائقؔ مرحوم سے سبق میں پڑھا تھا۔ یہ بات ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء کی ہے۔ جونپور کی جس مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا تھا۔ اُس مجلس میں قبلہ و کعبہ جناب سبط حسین صاحب فقیہ شریک تھے۔ بعد مجلس جناب مرحوم نے مجھ سے فرمایا آج مجھے جناب عارفؔ یاد آگئے۔ یہ مرثیہ میں نے اوائل عمر میں جناب عارفؔ سے سنا تھا یا آج تم سے سنا ہے۔ اس مجلس میں ایک سکھ بھی موجود تھا۔ میں نے اسے بین کے موقع پر زار و قطار گریہ کرتے ہوئے دیکھا۔

میں نے انیسؔ اور خانوادۂ انیسؔ کے مرثیوں کا چرچا اس خاندان میں دیکھا دوسرے مقامات پر نہیں دیکھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ لکھنؤ سے لیکر مٹیا برج کلکتہ شیخ پورہ حسین آباد بلکہ پورے صوبۂ بہار تک جو چرچا پایا وہ کسی اور جگہ کم پایا لکھنؤ سے خانوادۂ انیسؔ کے تمام شعراء صوبۂ بہار جاتے تھے مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ شیخ پورہ حسین آباد میں میر ابو علی خاں کے امام باڑے میں میں نے اُس منبر پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھا جس منبر پر خدائے سخن میر ببر علی انیسؔ بیٹھے تھے اور میر محمد نواب صاحب مونسؔ سید محمد صاحب سلیسؔ۔ میر عسکری صاحب رئیسؔ۔ میر خورشید علی نفیسؔ۔ خورشید حسن صاحب عروجؔ۔ میر علی محمد صاحب عارفؔ سید محمد حسن عرف لڈن صاحب فائزؔ میرے والد سید ظفر حسین صاحب عرف بابو صاحب فائقؔ مرحوم اور اس کے بعد احقر۔ یہ عزت مجھے شیخ پورہ حسین آباد کے منبر سے ملی۔

میر علی محمد صاحب عارفؔ کا رنگِ شاعری

جناب عارفؔ مرحوم کا شاہکار مرثیہ : مطلع

گرداب ہے سفینہ مرے دریائے سخن کا

اس مرثیے کو جناب عارفؔ مرحوم نے حضرتِ عباسؑ علمبردار کے روضۂ اقدس کے اوپر نذر کیا تھا یہ مرثیہ اب تک عراق کے کتب خانے میں موجود ہے اس مرثیے میں جناب عارفؔ نے چہرے میں جو شاعری اور غزل گوئی اور مرثیہ گوئی پر تنقید کی ہے وہ ان بندوں سے ظاہر ہے۔

اس فن کی ہمیشہ سے مسلّم ہے شرافت   کونین میں انساں کا ہے سرمایۂ عزت
کرتے تھے ائمہ بھی ثنا خوانوں کی حرمت   دیتے تھے صلے میں انہیں جنت کی بشارت

رُتبے جو ہیں اس فن کے نگاہوں پر چڑھے ہیں
معصومؑ نے خود شعر کہے اور پڑھے ہیں

پُر عبرت و افسوس کے قابل ہے یہ روداد　　وہ فن کہ جو ہے عزتِ دارین کی بنیاد
کرتے ہیں جہالت سے ہمیں لوگ اُسے برباد　　ہیں بندشیں کچھ طرفہ عجائب ہیں کچھ ایجاد
آزادہ سخن صورتِ مجذوب ہوئے ہیں
جو امر تھے معیوب وہ مرغوب ہوئے ہیں

سرقے سے کراہت ہے نہ پرہیز تنافُر　　ہے ذہن کو ہر وقت توارُد میں تبادُر
معنی میں تناقض ہے تو لفظوں میں تواتر　　طرّہ ہے پھر ان سب پہ تعلّی و تفاخُر
نافہموں کو تعریف و خوشامد سے غرض ہے
یہ ذوقِ سخن کا ہے کہ ہے کوئی مرض ہے

ہے شاعری و مرثیہ گوئی کا یہ اب حال　　دونوں روشِ سبزۂ بیگانہ ہیں پامال،
اس عہد کے طباعوں کو سوجھی ہے عجب چال　　جو حشر مضامین کو قیامت کی ہے تمثال
اس باب میں گو شکوۂ مصنفین بجا ہے
کچھ مرثیہ گویوں پہ مگر ظلم سوا ہے

استادنے جو ہیں طریقہ ہے یہ اُن کا　　جو مرثیہ اچھا کسی استاد کا دیکھا
تخریب پہ اس کی ہوئے فی الفور مہیا　　مضمون وہیں رکھے مگر الفاظ کو بدلا
تھامی جو عناں بارگیِ طبع پہ جم کے
طے کر گئے میداں کو نشانوں پہ قدم کے

کیا خوب یہ کورانہ روی اس پہ یہ نخوت　　کہتے ہیں کہ بازی میں ہمیں لے گئے سبقت
کس طرح نہ اس دعوۂ باطل پہ ہو حیرت　　افسوس کہ ہے مرثیہ گوئی کی یہ حالت
اس ذکر سے غیرت بخدا آتی ہے مجھ کو
اب مرثیہ گوئی سے حیا آتی ہے مجھ کو

فرماتے ہیں اس صنعتِ طرفہ کو تتبُّع　　کی خوب فنِ نظم میں تجویز توسُّع
اس ذہن کی پستی پہ ہیں خواہانِ ترفّع　　شاملِ کملا میں ہوں یہ رکھتے ہیں توقع
اظہارِ مراتب کو نگارش مری بس ہے
ہر مور کو اب جاہِ سلیماں کی ہوس ہے

رفتارِ سخن حد سے سوا بگڑی ہوئی ہے   ہر نظم کے شاہد کی ادا بگڑی ہوئی ہے
دیکھو جو غزل کو وہ جدا بگڑی ہوئی ہے   کچھ مرثیہ گوئی کی ہوا بگڑی ہوئی ہے
کیوں کہتے ہیں آخر جنہیں کہنا نہیں آتا
ناطق ہیں تو خاموش بھی رہنا نہیں آتا

ہم کو تو یہ اسلوب کسی طرح نہ آئیں   الٹا ہوا اوروں کا کلام اپنا بتائیں
احباب کا اصرار سے مجلس میں بلائیں   مضموں جو ہیں استادوں کے فخریہ سنائیں
قائل ہیں کہ یوں سحر بیانی نہیں آتی
ایسی تو ہمیں مرثیہ خوانی نہیں آتی

تھا شوق تو تہذیب سخن سیکھتے پہلے   جو اس کے لوازم ہیں وہ فن سیکھتے پہلے
بھاتا جو ہر اک کو وہ چلن سیکھتے پہلے   تقریر میں اندازِ حسن سیکھتے پہلے
شاہدوہ سخن دلکش و مقبول بھی ہوتا
بعد اس کے جو کچھ کہتے تو معقول بھی ہوتا

ملتا ہے یونہی کہنے سے کیا رتبۂ تصنیف   اس وضع کی تصنیف پہ ہیں طالبِ توصیف
ہوتے ہیں حدیثوں کی طرح مرثیے تالیف   جو سنتے ہیں کردیتے ہیں خاطر سے وہ تحریف
یہ ڈھنگ حقیقت میں زمانے سے جدا ہے
ہم بھی ہیں معترف کہ یہ ایجاد نیا ہے

ہو کس لئے دشوار بھلا نظم انہیں کرنا   کاغذ کو سیاہی سے فقط پڑتا ہے بھرنا
ہے سامنے کینڈا تو ہے پھر کاہے کا ڈرنا   تصویر سے تصویر کا آساں ہے اترنا
رنگ اپنی طبیعت سے نکالا نہیں آتا
تصویرِ خیالی کا بنانا نہیں آتا

بس بحرِ طبیعت نہیں بہتر یہ روانی   اونچا سرِ اعدا سے ہوا جاتا ہے پانی
حق اپنا ہے شیریں سخنی رطب لسانی   ہے نظم کہ سلک گہر بحرِ معانی

یہ لفظ ہیں یا دستۂ گل باندھے ہیں میں نے
اس بحر میں مضمونوں کے پل باندھے ہیں میں نے

سید ظفر حسین فائق: سید ظفر حسین نام، بابو صاحب عرفیت، فائق تخلص ۱۸۹۲ء لکھنؤ میں ولادت ہوئی۔ میر علی محمد صاحب عارف کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم کے نواسے تھے۔ اس اعتبار سے جناب فائق صاحب مرحوم میر ببر علی صاحب انیس کے پر پوتے تھے۔

بابو صاحب فائق کی ابتدائی تعلیم اردو و فارسی گھر پر ہوئی۔ عربی کی تعلیم مولوی عالم حسین سے حاصل کی جو ان کے گھر پر رہتے تھے اور مدرسۂ سلطان المدارس میں معلم تھے۔ فائق صاحب مرحوم نے بیس سال کی عمر میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملا فاضل کا امتحان پاس کیا۔

دس گیارہ برس کی عمر سے غزل کہنا شروع کی مگر تھوڑے ہی عرصے تک یہ سلسلہ رہا۔ اس کے بعد مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے اور غزل گوئی ترک کر دی۔ ان کی عمر ۲۴ سال کی تھی جب ان کے والد جناب میر علی محمد صاحب عارف نے ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا۔

کلام میں صرف دو تین مرثیے ہیں جو جناب عارف کے اصلاح شدہ ہیں ورنہ باقی تمام مرثیے باپ کے انتقال کے بعد تصنیف کئے ہیں۔ جناب عارف کے انتقال کے بعد اُن کی تقریباً تمام مجلسیں انہوں نے اپنی زندگی تک پڑھیں شہر کی سالانہ مجلسوں میں جو معین تھیں وہ یہ ہیں۔

۸ محرم الحرام کو حکیم میرن صاحب مرحوم کے یہاں پڑھتے تھے۔ میرن صاحب کے انتقال کے بعد حکیم صاحب عالم صاحب مرحوم نے اس مجلس کو باقی رکھا اور بابو صاحب فائق مرحوم تاحیات اس تاریخ کو مجلس پڑھتے رہے اور ان کے بعد سید الشعراء جناب نائق صاحب مرحوم نے تاحیات وہ مجلس پڑھی۔

اُن مجالس کے علاوہ شہر میں جو خاص مجلسیں وہ پڑھتے تھے وہ یہ ہیں:۔

فراش خانہ میں مشہدی نواب صاحب مرحوم کے یہاں شیش محل میں بڑے صاحب مرحوم کے یہاں اور یوں تو اربعین تک بہت کم دن ناغہ جاتے تھے جن میں وہ کہیں کوئی مجلس نہ پڑھتے ہوں۔

لکھنؤ کے باہر اُن کے پڑھنے کی خاص مجلسیں یہ ہیں:۔

(۱) مہاراجہ صاحب محمود آباد کے یہاں چہلم میں ایک مجلس پڑھتے تھے۔ مہاراجہ کی وفات کے بعد یہ مجلس برابر قائم رہی اور راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب اُن سے وہ مجلس پڑھواتے رہے (۲) اصغر آباد (نیڈراول) میں راجہ اصغر علی کے ہاں تعطیلاتِ گرما میں ایک مجلس پڑھنے جاتے تھے۔ (۳) شیخوپورہ حسین آباد میں سالانہ ایک مجلس پڑھنے جاتے تھے چند سال پٹنہ میں بھی ایک مجلس پڑھے ہیں۔ (۴) فیض آباد میں جواہر علی خاں کے امام باڑے میں سالانہ ایک مجلس پڑھنے جاتے تھے (۵) بنارس میں فاطمین میں ایک مجلس پڑھنے ہر سال جاتے تھے۔ (۶) حیدر آباد دکن میں آخر زمانے میں وہاں کے ایک رئیس نواب فقیر یار جنگ مرحوم نے سید الشعراء جناب فائق صاحب مرحوم کو عشرہ پڑھنے کے لئے بلایا۔ مرثیہ سننے کے بعد ایسے محظوظ

ہوئے کہ پھر ہر سال بلا کر عشرہ پڑھوانے لگے وہاں جناب فائقؔ صاحب مرحوم ۴ یا ۵ سال عشرہ پڑھنے گئے تھے ۱۹۴۴ء مطابق ۱۴ شعبان ۱۳۶۳ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور میر انیسؔ کے پائیں یا مقبرۂ میر انیسؔ میں دفن کئے گئے۔

کلام فائقؔ: ان کا کلام مرثیے سلام اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے مرثیہ گوئی میں بزرگوں کے قائم کردہ حدود کو باقی رکھا۔ ان کے مرثیے اب تک شائع نہیں ہو سکے۔ غیر مطبوعہ چند مرثیوں سے نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

صبح کا منظر

سپیدۂ سحری کا ظہور ہونے لگا		ہوائے سرد کا پیہم مرور ہونے لگا
جہاں میں نور و ضیا کا وفور ہونے لگا		خمار بادۂ شب سر سے دور ہونے لگا
بدل کے چال ہوا صبح کو جو چلنے لگی
دماغ اور ہوئے کیفیت بدلنے لگی

وہ صبح اور چمن کا وہ قدرتی انداز		ہوائی ہے حسن سے حیرت ذہن کھول کے ہیں باز
کھلے جو غنچے تو قدرت کے اور کھل گئے راز		بچھائی خاک پہ سبزے نے بھی جبینِ نیاز
تمام اہلِ خرد کا میاب کہتے ہیں
جو ہوشمند ہیں کب اس کو خواب کہتے ہیں

اذان کی تعریف

وہ حُسنِ صَوت وہ قرأت وہ لحن خوش انداز		وہ شد و مد وہ فصاحت وہ خوش نما آواز
ملک بھی وجد میں ہیں ہوش کر گئے پرواز		سُنیں تو حضرتِ داؤد کو ہو کبھی ناز
صدا اذاں کی جو گوشِ فلک میں جاتی ہے
تو عرش سے بھی صدائے درود آتی ہے

علم کی تعریف

ہو سکے اس علم پاک کی کس طرح ثنا		آنکھ خورشید کی جھپکاتی ہے پنجے کی ضیا
سرخ پٹکے سے عیاں سُرخیِ خونِ شہدا		اس پھر یرے سے ہے سنکی ہوئی طوبیٰ کی ہوا
چوب میں مشک بندھی دیکھ کے غم کھاتے ہیں
خضر و الیاس زیارت کے لئے آتے ہیں

پست ہے جس سے مہ و مہر کی رفعت وہ علم		جس سے تھی لشکرِ اسلام کی زینت وہ علم
جس کی ہے آج تلک کفر پہ ہیبت وہ علم		دوش پر رکھ کے جسے بڑھتی ہے جرأت وہ علم

تھے یہی غیظ میں خالق کے ولی کے تیور
آج عباس کے تیور ہیں علیؑ کے تیور

ساقی نامہ

بادہ خواری کا ہے ہنگام یہی ہاں ساقی بھر دے ساغر میں زلالِ مئے عرفاں ساقی
دُور ہو دور سے دورِ غمِ دَوراں ساقی جانیں مستوں کی ترے نام پہ قرباں ساقی
جانِ ہر رند اسی نشے میں تن سے نکلے
یا علیؑ لب پہ ہو جب روح بدن سے نکلے

ساقیا بادہ کشی مثلِ عبادت ہو شروع نیتیں سب کی لگی ہیں کریں سب دل سے رجوع
رند سجدے کریں دیکھیں جو صراحی کا رکوع آفتاب آج ہے جلوہ نما قبلِ طلوع
شورِ تکبیر ہو دیکھیں جو پری کی صورت
ختم ہو دَور نمازِ سحری کی صورت

تلوار کی تعریف

یہ تیغ ناصرِ پیغمبرِ انام رہی جہادِ راہِ خدا میں علم مدام رہی
ہمیشہ زیب وہ پہلوئے امام رہی علیؑ سے بسترِ راحت پہ ہم کلام رہی
کبھی کلیم صفت رازِ دل نہ کھولتی تھی
جو بولتی تھی تو نورِ خدا سے بولتی تھی

بیان کیا ہو کسی سے فضیلت و رفعت عبادتِ دو جہاں سے فزوں ہے اک ضربت
ہر اک مہم میں محمدؐ کی اس نے کی نصرت جہادِ حیدرِ صفدر کو اس نے دی شہرت
رضائے حق پہ چلی دیں کا انصرام کیا
نبیؐ کا کام کیا اور علیؑ کا نام کیا

خاندانِ انیس کے ساتھ ہم کو ایک ایسی بڑی خصوصیت نظر آتی ہے جو کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں پائی گئی سلف سے آج تک بڑے بڑے نامور شاعر گزرے لیکن ان کا نام یا شہرت ان کی ذات کے ساتھ محدود رہی مثلاً میر تقی میر ہی اپنی ذات سے خدائے سخن ہوئے نہ ان کے باپ کو کوئی بحیثیت شاعر جانتا ہے نہ ان کے بیٹے کو نہ ان کے کسی بھائی کو۔ اسی طرح دوسرے مشہور شعراء کو لیجئے، ذوق، سودا، مصحفی، آتش، ناسخ، غالب، مومن وغیرہ سب اپنی ذات سے مشہور ہوئے۔ ان کے خاندان کے دیگر افراد کا نام شعراء کی فہرست میں نہیں ملتا۔ یہ خصوصیت صرف انیس کے خاندان میں نظر آتی ہے کہ

پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں انیسِ خاطرِ آشفتہ حالاں

ناصرِ رسالت و امامت مؤیّد بروح القدس حضرت میر انیسؔ علیہ الرحمۃ والرضوان

ناصرِ رسالت و امامت و مؤید بروح القدس ایسے القابات ہیں جو نہ مقالہ نگار کے دماغ کی تخلیق ہیں اور نہ اس شاعرِ عظیم کو کسی ادارۂ شعر و سخن نے عطا کئے ہیں بلکہ انہیں دربارِ دُر بارِ ختم رسالت کا عطیہ کہنا چاہیئے۔

بارگاہ ختمی مرتبتؐ کے شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری ہیں جنہوں نے سرکار ولایت علی مرتضیٰ ادواحنا لہٗ الفدا کا قصیدہ انشا کیا اور ستر ہزار سامعین کی موجودگی میں سرکار رسالت کے حضور میں پیش کیا اور پڑھا اس میں شاہ بیت یہ شعر تھا۔

قال لہ قم یا علی فاننی رضیتک من بعدی اماماً و ھادیاً

(دیوان حسانؔ و مناقب صدر الائمہ)

حضرت حسانؔ نے طویل خطبۂ رسالت کو ایک بیت میں سمو دیا اور مختلف المعنیٰ لفظ "مولا" پر جو تنازع ہے اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور بتلا دیا کہ فی بطن الخطیب جو معنی ہیں وہ امام و ہادی ہیں۔ زبانِ وحی ترجمان نے اسی معنی کی تصدیق اس دعائیہ میں کی۔ یاحسان لاتزال مؤیداً بروح القدس حتیٰ نصرتنا بلسانک (مناقب صدر الائمہ)

"اے حسانؔ جب تک تو اپنی زبان سے ہماری مدد کرتا رہے گا روح القدس ہمیشہ تیری مدد کرتا رہے گا۔"

اس دعا و تحسین سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مدح رسالت و امامت کی نصرت ہے۔ آیات قرآنیہ کی تفسیر اور

ص ص ایک طرف باپ اور دادا نامور شعراء میں داخل، دوسری طرف جتنے بھائی وہ سب اور اس کے بعد بیٹے پوتے نواسے سب ممتاز شاعر گذرے۔ اس کا اظہار خود میر انیسؔ کی زبان سے ملاحظہ ہو۔

اس ثناخواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح جدِ اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح
باپ مداح کا مداح ہے دادا مداح عمِ ذی قدر ثناخوانوں میں یکتا مداح
جو عنایاتِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

احادیث نبویہ کی ترجمانی نصرتِ رسالت وامامت ہے۔ یہ استعداد نصرت انسان کو تائید روح القدس سے حاصل ہوتی ہے حضرت حسانؓ صرف ایک مدحت سے ناصر و مؤیّد ہوگئے اور حضرت انیسؒ کی تو اسی ثناخوانی میں بسر ہوئی۔

خود فرماتے ہیں۔ ؎ عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ان کا دن رات یہی کام تھا ؎ ہر چند زبان کیا مری اور کیا مری تقریر دن رات وظیفہ ہے ثناخوانیٔ شبیرؑ

رسول کی دعا حسان کے لئے مشروط ہے کہ جب تک تو ہماری ثنا و مدحت کرے گا ہمیشہ روح القدس کی تائید تیرے شامل حال رہے گی۔ کسی اور کی مدح میں یہ کیفیت نہیں ہوگی۔ مگر میر انیس نے غیر کی مدح کو اپنی غیرت کے منافی اور اپنی کسرشان خیال کیا اس سلسلہ میں خود فرماتے ہیں۔ ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثناخواں ہو کر مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

اس شعر کی رو سے میر انیس نے اپنے لئے دو لقب اختیار کئے ہیں۔ ثناخوانِ شبیرؑ اور سلیمانِ مملکتِ فصاحت و بلاغت اکثر احبار توریہ میں حضرت سلیمانؑ کے لئے کہا گیا ہے کہ

اللہ نے حضرت سلیمان کو ایسی مملکت دی کہ ان کے بعد کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

الیہ کربلا کی ترجمانی میں مملکت فصاحت و بلاغت میں جو اقتدار انیس کو حاصل ہوا کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

اسم سامی و نام نامی

حضرت انیس کا اسم گرامی میر ببر علی انیس ہے۔ عربی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے۔ اِنَّ الْاَسْمَآءَ تَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ (تحقیق نام آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں) درحقیقت بعض نام آسمانوں سے ہی نازل ہوتے ہیں۔

روایت ہے کہ جب جناب امیر علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت ابوطالبؑ نے کعبہ کا پردہ پکڑ کر یہ اشعار پڑھے (ترجمہ) اے اندھیری رات اور صبح روشن کے مالک میں پوچھتا ہوں اس شیرخوار بچہ کا تیرے ہاں کیا نام ہے؟ ناگاہ غیب سے آواز آئی (ترجمہ) تم نے ہم سے اس پاک مہذب اور پسندیدہ بچے کی نسبت پوچھا ہے۔ اس کا نام آسمان کی بلندیوں میں علی (بلند) ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام "العلی" سے مشتق ہے۔

میر انیس کا نام میر ببر علی انیس ہے۔ میر کا لفظ صرف سادات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ امیر کا مخفف ہوتا ہے میر انیس نسبی اور خاندانی لحاظ سے امیر یا میر ہیں۔ اس کے علاوہ کلام کے لحاظ سے بھی انہیں امیر کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کا کلام "کلام الامیر امیر الکلام" ہے۔ ببر علی کے لحاظ سے اگر علی سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ اسد اللہ ہیں اور اگر علی سے مراد جناب امیر علیہ السلام ہیں تو وہ اسد اللہی ہیں۔ حضرتِ غالب کو جو جناب امیر علیہ السلام سے عقیدت تھی اس کے لحاظ سے انہوں نے کہا تھا ؎ ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم

یں اسد اللہ بھی ہوا اور اسد اللہی بھی ہوں۔ یہی صورتِ حال میر انیس کے نام میں بھی موجود ہے کہ وہ اسد اللہ بھی ہیں اور اسد اللہی بھی ہیں۔ میر انیس مرحوم پہلے حزیں تخلص کیا کرتے تھے۔ جب فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے تو انہوں نے اپنا تخلص انیس کر لیا حقیقت میں وہ " انیسِ خاطرِ آشفتہ حالاں ہیں "۔ کیونکہ دنیا بھر کے اہلِ دل غمِ حسین میں مغموم و محزون اور آشفتہ حال ہیں اور میر انیس ان کے غم و حزن میں انیس ہیں۔

تعلیم و تربیت میر انیس نے علوم دینی کی ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی سے حاصل کی۔ پھر انہیں مقالہ نگاروں کے استاذ الاساتذہ معقولات و منقولات میں یگانہ مفتی میر محمد عباس اعلی اللہ مقامہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑا۔ مفتی صاحب تین زبانوں میں شاعری فرماتے تھے اور ان کا کلام ان تینوں زبانوں (عربی، فارسی اور اردو) میں اپنی مثال آپ ہے میر انیس نے معقولات بھی صدرہ میر محمد عباس سے پڑھی تھی۔ فنونِ سپہ گری میر کاظم علی صاحب اور ان کے فرزند ارجمند میر امیر علی صاحب سے حاصل کئے تھے جو اس فن میں زمانے کے استاد مانے جاتے تھے۔ فنِ شہسواری سے بھی واقف تھے۔ فنِ سپہ گری کی معلومات، جنگ کے مناظر وغیرہ دکھانے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔

بحیثیتِ شاعر میر انیس کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کا توارثِ صفات اسی لحاظ سے بے نظیر تھا کہ کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور و معروف شعراء کا نہیں پیش کر سکتا۔ لہٰذا میر صاحب کو اپنی اس حیثیت پر فخر تھا وہ خود فرماتے ہیں ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس جب لکھنؤ میں آئے تو ان کے والد انہیں ناسخ کے پاس لے گئے۔ ناسخ نے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ تخلص بدل ڈالو۔ انیس نے شروع سے ہی مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے اس فن کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔

میر انیس اور غالب مقالہ نگار کے سلسلۂ اساتذہ میں سرکار شریف العلماء مولانا سید شریف حسین خاں استادِ اکبر ہیں

ایک اعلان

بہت سی اطلاعات، اعلانات کتابوں پر تبصرے وغیرہ "پیام عمل" کے اس خاص نمبر میں شائع نہیں ہو سکے انشاء اللہ آئندہ شمارے میں ان سب کی اشاعت کا سرانجام ہو سکے گا۔ (مدیر)

وہ علوم وادب میں یگانۂ روزگار تھے۔ بیس برس تک انہوں نے عراق کے شہرۂ آفاق شعرا شیخ جعفر شوستری سے اور مجتہد اعظم سید محمد حسن شیرازی سے علوم دینیات کی تعلیم پائی تھی۔ شاعری میں وہ میر انیس کے شاگرد تھے۔ اس تلمذ پر وہ فخر کیا کرتے تھے۔ حضرتِ غالب جو اس زمانے میں دنیائے شعر و سخن پر چھائے ہوئے تھے، اُن کے سرکار شریف العلما سے تعلقات تھے۔ سرکار شریف العلما دہلی تشریف لے گئے تو حضرت غالب ان سے ملاقات کے لئے آئے اور کہا میں نے بھی ایک مرثیہ لکھا ہے جو حضرت علی اکبرؑ کی شہادت پر مشتمل ہے اور وہ مرثیہ سرکار شریف العلما کو بھی سنایا۔ اس پر سرکار شریف العلما نے اپنے استاد میر انیس کا مشہور مرثیہ ع دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ ۔ پڑھ کر سنایا۔ اسے سن کر مرزا غالب نے اپنا مرثیہ پھاڑ ڈالا اور کہا "یہ میدان میرا نہیں میر انیس کا ہے۔"

میر انیس لکھنؤ کے باہر جانا نہیں چاہتے تھے۔ جب کبھی باہر جانے کا ذکر ہوتا تو فرماتے کہ میرے کلام کو شہر لکھنؤ کے لوگ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اس کی کیا قدر کرے گا۔ لیکن لکھنؤ کی تباہی کے بعد وہ پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی صاحب کی دعوت اور بے حد اصرار پر عظیم آباد پڑھنے تشریف لے گئے اور واپسی میں ایک دفعہ بنارس بھی ٹھہرے۔

۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ بہادر نظامِ دکن اور اہل دکن کی تحریک اور نواب تہور جنگ بہادر اور سرکار شریف العلما کے اصرار پر حضرتِ انیس حیدرآباد میں تشریف لائے۔ اس مجلس میں لوگ اس کثرت سے جمع تھے کہ باوجود شاہی سخت انتظام اور پہروں کے چپہ بھر زمین سننے والوں سے خالی نہ تھی۔ وہاں میر انیس نے جو مرثیہ پڑھا اس کا مطلع یہ تھا ع جب نوجواں پسر شہِ دیں سے جدا ہوا ــــ اور لوگوں کا تو کیا ذکر نظامِ دکن اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے داب شاہی کے خلاف کھڑے ہو ہو کر داد دیتے تھے۔ جب مجلس ختم ہوئی تو میر صاحب کے پاس آئے اور کہا ــ "اگر یہ کہوں کہ آپ اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں تو آپ کی تعریف نہیں بلکہ تنقیص ہے۔ دنیا کی کسی زبان نے آپ جیسا جامع شاعر پیدا نہیں کیا۔" اس تحسین و آفریں سے میر انیس پر شدید رقت طاری ہوئی اور جب اس رقت سے افاقہ ہوا تو فرمایا مجھے اللہ نے ایسا ممدوح دے دیا ہے کہ اس کی وجہ سے کلام بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے۔

افریقہ میں ایک کتاب لکھی گئی جس میں انیس اور شیکسپیئر کا موازنہ تھا۔ اس کتاب کے مؤلف میرے عزیز دوست حبیب لبیب سید علی مہدی تھے جو شیعہ اثنا عشری کالج کے پرنسپل تھے۔ جب یہ کتاب انگریز گورنر نے (جن کا نام اُس مرضِ فالج کی وجہ سے میں فراموش کر چکا ہوں) دیکھی تو اس پر یہ ریمارکس لکھے کہ اس کتاب کو تعلیمی لائبریریوں میں رکھا جائے اور میر علی مہدی کو محکمہ تعلیم کا مشیر قرار دیا جائے۔ اس کتاب Anis Versus Shakespeare نے افریقہ کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبولیت حاصل کی۔

کلام میر صاحب نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات اور رباعیاں لکھیں۔ افسوس ہے کہ ان کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔ جس قدر کلام شائع ہوا ہے وہ پانچ جلدوں میں ہے باقی ان کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔

میرانیسؔ کے کلام میں ایسی جدّت ہے جس نے پرانی ادبی طرز تحریر کو ماند کر دیا ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

اک فرد پرانی نہیں دفتر میں ہمارے   بھرتی ہے نئی فوج کی لشکر میں ہمارے

قادر الکلامی کے متعلق ارشاد فرمایا ہے ؎

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں   اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

تنوع مضامین کے ضمن میں فرمایا ہے ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار   خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

میرانیس اور رزمیہ اردو متعدد اصناف سخن سے مالامال تھی مگر اس زبان میں رزمیہ کی کمی تھی جو میرانیسؔ کے مراثی ہی نے پوری کی۔

حضرت حبیب ابن مظاہر کے حملے کی منظر کشی کس شان سے بیان کی گئی ہے۔

چمکی عجب انداز سے اس شیر کی تلوار   گویا سرِ اعدا پہ گری برقِ شرر بار
ڈھالوں سے بدن اپنا چھپاتے تھے سیاہ کار   اس دست زبردست کا رکتا تھا کوئی وار
کچھ امن نہ تھا خود و زرہ سے تن و سر کو
سینے سے گزر جاتی تھی دو کر کے سپر کو

کاٹے ہوئے پھل برچھیوں کے ان میں پڑے تھے   سہمے ہوئے گوشوں میں کماں دار کھڑے تھے
چھایا تھا ہراس ان پہ ہمیشہ جو لڑے تھے   آنکھیں وہ چراتے تھے بہادر جو بڑے تھے
دہشت سے زرہ پوشوں نے جی چھوڑ دیا تھا
اس تیغ نے تیغوں کا بھی منہ موڑ دیا تھا

اس مقالے کی تحریر کے وقت مضامین ساون کے بادلوں کی طرح امڈ امڈ کر آ رہے ہیں مگر طوالت کا خوف بڑھنے نہیں دیتا۔ جس طرح میرانیسؔ کا کلام لاجواب ہے ان کے کلام کے پڑھنے کا طریقہ بھی لاجواب تھا۔ ان کی آواز، قد و قامت، صورت غرض ہر شے اس کام کے لئے موزوں واقع ہوئی تھی۔ وہ قدِ آدم آئینہ سامنے رکھ کر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔

میں نہایت صغر سنی میں میرانیسؔ کی رباعیات و قطعات اور سلام پڑھا کرتا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں میں نے پہلی مرتبہ منبر پر میرانیسؔ کا یہ مشہور مرثیہ پڑھا۔ ؎

دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ

آٹھ برس یہ سلسلہ جاری رہا اس کی مشق سے میں نے نشو و نما پا کر ۱۹۱۰ء میں مقرر کی حیثیت سے پہلی مجلس پڑھی۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ خطابت اور روضہ خوانی کے بلند مقام پر پہنچنے کے لئے کلام انیسؔ ایک نردبان یعنی سیڑھی ہے۔ یاد ہے بجز جگراؤں میں محرم کے ایام میں تحت اللفظ مرثیہ خوانی کی مجالس ہوا ہوتی تھیں۔ اس فن کی تربیت کیلئے جگراؤں

عظیم الشان تربیت گاہ تھی جس کے مربی خود بنفس نفیس سرکار شریف العلماء اعلی اللہ مقامہٗ تھے
میر انیس کی وفات حسرت آیات بعارضۂ بخار ۱۲۹۱ھ سنہ ۱۸۷۴ء میں ہوئی آپ اپنے باغ میں ہی دفن ہوئے مگر ان کے اپنے ارشاد کے مطابق وہ اب وہاں نہیں ہیں۔ ؎

مرقد میں انیسؔ نہ کفن میں ہوگا — وہ روضۂ سلطانِ زمن میں ہوگا
چل کر گلزار کربلا میں ڈھونڈیں — بلبل کا مزار بھی چمن میں ہوگا

یہی ان کی وہ خوابگاہ ہے جسے انہوں نے مر مر کر بسایا ہے اسی سے وہ لپٹ کر سو رہے ہیں۔ ؎

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

سرکار شریف العلماء چند مجالس عزا بپا فرماتے تھے۔ وہ تربیت گاہ کے تربیت یافتوں کے مقابلے کی مجالس ہوتی تھیں ان مجالس میں میر انیس کے نواسے میر کاظم حسین اور میر نفیس کے شاگرد رشید میر ابرار حسین مصطفےٰ آبادی اپنے فن کے کمال کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ جگراؤں کی تربیت گاہ نے کلام میر انیس کی نشر و اشاعت کرنے والے ناشرِ مذہبِ اہلِ بیت مرثیہ خواں پیدا کئے جو اس فن میں کامل تھے۔ میر عباس حسین برادر زادہ و داماد سرکار شریف العلماءؒ ان کے فرزند سید احمد سرکار شریف العلماءؒ کے نواسے میر محمد جعفر سرکار شریف العلماء کے عم زاد سید کرار حسن کے فرزند اودھ و یوپی کا تو کیا ذکر مشرقی پنجاب کلام میر انیس کا مرکز تھا۔

علامہ اقبال پر اثرات مقالہ نگار جب اورینٹل کالج میں طالب علم تھا تو اس نے دیکھا کہ علامہ اقبال ہر ایسی مجلس عزا میں جس میں کلام انیس پڑھا جاتا شرکت فرماتے۔ کلام اقبال میں سرکار محمد و آل محمد کا حصہ نہایت عظیم الشان ہے۔ یہ مجالسِ عزا کے ہی اثرات ہیں۔

حرفِ آخر حضرت انیسؔ مقالہ نگار کا جو ابتدائے عمر سے آپ کے فیوض سے مستفیض رہا۔ سلام نیاز قبول فرمایئے جس طرح آپ نے المیۂ کربلا کی ترجمانی فرمائی۔ وہ ہماری قوم پر احسانِ عظیم ہے جس سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ خدا ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

شاعرِ اعظم میر انیس کی ۹۸ سالہ برسی کے موقع پر

یوم انیس

پروفیسر مظہر عباس نقوی

پیام عمل کی تنگ دامانی کے پیش نظر اس معلومات افزا مضمون میں کچھ اختصار کرنا پڑا ہے۔ (مدیر)

میرانیس کی ۹۸ ویں برسی کے موقع پر "انجمن یادگار میرانیس کراچی" کے زیر اہتمام ۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی "خیابان میرانیس" میں "یوم میرانیس" منایا گیا۔ کراچی میں اس سلسلے کی یہ پہلی عظیم الشان تقریب تھی۔ انجمن نے صد سالہ برسی کی تحریک یکم فروری ۱۹۷۱ء کو شروع کی تھی۔ گزشتہ دو سال میں اندرون ملک انقلابات برپا ہوتے رہے لیکن انجمن کی تحریک کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ البتہ ہجری کے حساب سے صد سالہ تقریبات منعقد نہ ہو سکیں لیکن یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ء کو میرانیس کی صد سالہ برسی اعلیٰ پیمانے پر پورے ملک میں منائی جائے گی۔

انجمن یادگارِ انیس کی تحریک پر پاکستان کے مشہور ماہناموں اور ہفت روزہ اخباروں نے انیس نمبر شائع کیے۔

سب سے پہلے اسی انجمن نے ایک مجلہ "یادگار انیس" کے نام سے فروری ۱۹۷۱ء میں شائع کیا تھا۔

کراچی کے تمام کالجوں اور اسکولوں کے میگزینوں میں میرانیس کے متعلق مخصوص مضامین شائع کیے گئے۔ انجمن کے روحِ رواں ضمیر اختر نقوی نے خلوص دل سے اس کام میں دلچسپی لی اور اپنی کم سنی کے باوجود وہ کام کیا جو بزرگوں ہی سے ممکن تھا۔ ضمیر اختر صاحب کی کوشش سے میرانیس کی حیات اور فن پر مضامین اور نظمیں لکھی گئیں۔ وہ خود بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ سب سے زیادہ لکھا اور میرانیس پر تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مذکورہ بالا یوم میرانیس بھی انہیں کی کاوشوں سے منعقد ہوا۔ کراچی ایسے بڑے شہر میں جلسہ کرنا ایک ۲۰ سال کے نوجوان طالب علم کی بات نہ تھی لیکن قدرت کی مدد شامل حال تھی۔ اس لیے کامیابی ہوئی۔

"یوم میرانیس" ۱۰ دسمبر کو ٹھیک ۱۰ بجے دن میں کلام مجید کے سورہ شعرا کی تلاوت سے شروع ہوا۔ سورہ شعرا کی آیات کے مطابق میرانیس ایسے ہی شاعر تھے جنہوں نے عبادت کی اور نصرتِ مظلوم میں سب سے آگے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرانیس مظلوم بھی شاعر بھی ہیں۔ تعصبات نے میرانیس کو ان کے مقام سے ہٹانے کی کوشش کی ہے لیکن انشاء اللہ الیہ نہ ہو سکے گا (ذاکر)۔ تلاوت ختم ہونے پر نیر رضا صاحب رضوی نے میرانیس کا مشہور سلام

گھر کا بوجھ جو گرد وں پہ ہم اٹھا کے چلے — خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

پیش کیا اور خوب داد حاصل کی۔

ضیاء تقوی صاحب کے بعد جناب اشرف عباس نے بھی میر انیس کا سلام ترنم سے پیش کیا۔

سہ کوئی انیس، کوئی آشنا نہیں رکھتے کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

جناب زیڈ اے بخاری، جناب سید ہاشم رضا، جناب نسیم امروہوی اور جناب اصغر حسین (فرزند بابو فائق صاحب) جناب سید یوسف حسین (فرزند میر عارف) ۹ بجے سے تشریف لا چکے تھے اس لئے پڑھنے والوں کو سامعین کے علاوہ ان حضرات سے بھی خوب داد مل رہی تھی۔ تعریف تو دراصل خدائے سخن کی ہو رہی تھی۔

آباد محمد نقوی زائر امروہوی صاحب نے ترنم سے میر انیس کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

فطرتِ انسانیت کا معتبر محضر انیس واقعاتِ کربلا کا مستند دفتر انیس

استاد قمر جلالوی کے شاگرد جناب اعجاز رحمانی نے تحتِ لفظ مسدس پیش کیا ع

ضیائے بزمِ ادب شمعِ ذی وقار انیس

جناب اعجاز رحمانی کے بعد جناب ضمیر اختر نقوی صاحب نے مہمانوں کی اجازت سے اپنی تقریر شروع کی مختصر اور جامع تقریر سے ضمیر اختر نقوی صاحب نے مجمع پر سحر کر رکھا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے میر انیس نے مالکِ کائنات کے حضور دعا کی۔

یارب! چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

قدرت نے آواز دی انیس ہم نے تمہارے چمنِ نظم کو گلزارِ ارم بنا دیا۔ تمہاری خشک زراعت کو سرسبز و شاداب کر دیا ہم نے تم کو معجز بیان بنا دیا جب تک آفتاب میں چمک رہے گی ملکِ سخن کی شاہی تمہارے پاس رہے گی۔

...... اور مانگو...... کیا مانگتے ہو...... میر انیس نے پھر دعا کی؛

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم	خیبر کی خبر لائے مری طبعِ اولوالعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم	دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم

جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

قدرت نے آواز دی تمہاری زبان معرکۂ رزم دکھائے گی۔ ہم نے تمہاری زبان میں تاثیر دے دی۔ تمہاری سیفِ زبان ہمیشہ عدو کے لئے آگ بھڑکاتی رہے گی۔ مانگو اور کیا مانگتے ہو۔ میر انیس نے دعا کی:

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی	عالم کو دکھا دے یہ روش سیفِ الٰہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی	لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی

ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

قدرت نے آواز دی ہم نے تمہاری دعا کا ایک ایک لفظ قبول کیا۔ ملکِ سخن میں تمہارا سکہ قیامت تک جاری رہے گا۔ طبل و علم کے تم مالک ہو۔ زبان پر تمہاری حکومت رہے گی۔ میر انیس نے بے اختیار ایک شکوہ کیا:

نا قدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا	کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا	میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا

عالم ہے مکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

شکوہ کرتے ہیں اس ہستی کا واسطہ دیا جس کا واسطہ دے کر آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی۔ نوحؑ کا سفینہ بچا، یوسفؑ قید سے آزاد ہوئے۔ یونسؑ ماہی کے شکم سے باہر آئے۔ وہ عظیم نام جس کا ورد ختمی مرتبتؐ نے جنگ تبوک میں لیا تھا۔

تائید کا ہنگام ہے یا حیدرِ صفدر	امداد ترا کام ہے یا حیدرِ صفدر
تو صاحبِ اکرام ہے یا حیدرِ صفدر	تیرا ہی کرم عام ہے یا حیدرِ صفدر

تنہا ترے اقبال سے شمشیر بکف ہوں
سب ایک طرف جمع ہوں میں ایک طرف ہوں

میر انیس کی یہ دعا بھی قدرت نے قبول کر لی۔۔

سب ایک طرف ———————— میر انیس ایک طرف

محمد قلی قطب شاہ سے لے کر اب تک کے تمام شعراء کو ایک طرف رکھئے اور میر انیس کو دوسری طرف پھر بھی میر انیس کے کلام کا پلّہ بھاری رہے گا۔

اس دعا کے بعد میر انیس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اور انہوں نے کہا:۔

تھا جوش کچھ ایسا ہی جو دعویٰ کیا میں نے　　خود سر بگریباں ہوں کہ یہ کیا کیا میں نے
اک قطرۂ ناچیز کو دریا کیا میں نے　　تقصیر بحل کیجئے بے جا کیا میں نے

ہاں سچ ہے کہ اتنی بھی تعلّی نہ روا تھی
مولا! یہ کلیجے کے پھپھولوں کی دوا تھی

ضمیر اختر صاحب نے کہا کہ میر انیس کو اس بات کا رنج تھا کہ زمانہ ان سے غزل گوئی کی خواہش کر رہا تھا دنیا کہہ رہی تھی کہ میر حسن مصنف "سحر البیان" کا پوتا اور میر خلیق جس کی غزل پر آتش نے ایک مشاعرے میں اپنی غزل پھاڑ دی تھی۔ اس کا بیٹا غزلیں نہیں لکھتا۔ میر انیس اگر چاہتے تو عظیم غزل گو ہو سکتے تھے جنہوں نے بچپن میں غزل کے ایسے لاجواب شعر کہے:۔

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا　　ان کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

مثالِ ماہیٔ بے آب موج تڑپا کی　　حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلے

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں　　پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

لیکن میر انیس نے فیصلہ کیا کہ صرف حسین ابن علیؑ کی نصرت کروں گا۔ دنیاوی محبوب کی مدح و ثنا میں کیا رکھا ہے۔ اب تک غزل نے کونسا اخلاقی درس دیا ہے۔ ہاں غزل کا لطف مرثیہ میں پیش کروں گا۔

میر تقی میر نے کہا:۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

ہنستی ہوئی آنکھ کی تعریف سب کر لیتے ہیں لیکن آنکھوں میں آنسو بھرے ہوں ان پر غزل کہنا آسان نہیں یہ حصہ میر انیس کا تھا جناب علی اکبرؑ رات بھر جاگے تھے شہزادہ علی اکبرؑ کی آنکھوں کو میر انیس نے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا:۔

روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں　　نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

میر انیسؔ نے حسینؑ ابن علی کی آنکھوں کی تعریف کی اور ۴۵ صفتیں بیان کر کے غزل گوئی کو شرمندہ کر دیا۔

آنکھوں کو کہئے عین تو عین خطا ہے یہ — پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہے یہ
سب کو ہے چشم داشت کہ عینِ عطا ہے یہ — بیمار خود پہ سب کے مرض کی دوا ہے یہ
سرخوش ہے جام ان کی جو الفت کا پی گیا
دیکھا نگاہِ لطف سے جس کو وہ جی گیا

(اب یہاں سے تین بند ہیں اور ۵۳ صفتیں :۔

احسان بھی حیا بھی مروت بھی قہر بھی — و موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی
بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی — تسنیم بھی بہشت بھی کوثر کی نہر بھی
سر شرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں
جنت سواد میں ید بیضا بیاض میں

آہو شکار و مست و کماں دار و شیر گیر — ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دل پذیر
خوں ریز و جاں ستاں و دلآویز و بے نظیر — قبضے میں ابروؤں کی کمانیں مژہ کے تیر
جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو
ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

آہو فریب و عشوہ فروش و کرشمہ ساز — طناز و سرمگیں و گراں خواب و سرفراز
حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز — بیدار و داغ دیدہ و خونبار و غم طراز
گرد اس کے پھر یہ کعبۂ ایماں کا طوف ہے
بس اے انیسؔ بس نظرِ بد کا خوف ہے

ضمیر اختر صاحب کو میر انیسؔ کے کلام کی بہترین ادائیگی، حافظہ اور ذہانت کی خوب خوب داد ملی۔ ضمیر اختر صاحب کی تقریر کے بعد جناب اختر وصی علی (ریڈیو پاکستان) نے میر انیسؔ کی دو غزلیں ترنم سے پیش کیں۔

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح — کٹے جو عیب بھی ہم نے تو وہ ہنر کی طرح

اشارے کیا نگہِ نازِ دلربا کے چلے — جب ان کے تیر چلے نیچے قضا کے چلے

اختر وصی علی صاحب کے بعد جناب زیڈ بخاری (سابق ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) نے "شاہکار انیس" شروع کیا۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے — جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے — مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو! فریضۂ سحری کو ادا کرو

جب حضرت عباس علمدارؑ کی منصبِ علمداری کے بند آئے اور حضرت عونؑ و محمدؑ اور جناب زینبؑ کی گفتگو کا آغاز ہوا تو ایک بند کے ایک مصرعے کو بخاری صاحب نے اس طرح ادا کیا کہ مجمع حیران رہ گیا:-

"ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھے گا یہ علم"

بخاری صاحب نے یہ مرثیہ بارہا پڑھا ہے لیکن آج کی بات ہی کچھ اور تھی۔ داد و تحسین کے نعرے بلند تھے۔ آنسوؤں کی بارش تھی۔

امیر امام صاحب حُر نے میر انیس کے سلام پر تخمیس پیش فرمائی۔ امیر امام حُر راجہ صاحب محمود آباد کے بھانجے ہیں اور مشہور ادیب و نقاد شمس العلما امداد امام اثر کے پوتے ہیں۔

تخمیس کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

گو کہ منصب ہے ولا ہیں ابتلا میرے لئے — معرفت کا ہے وسیلہ کربلا میرے لئے
درسِ حکمت ہے پیامِ کربلا میرے لئے — "خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے"
"شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے"

جناب عزت لکھنوی نے میر انیس کو یہ خراجِ عقیدت پیش کیا:-

مرثیے کا دُرِ شہوارِ مجلّٰی ہیں انیس — موجۂ فکر ہیں مضمون کے دریا ہیں انیس
ذوقِ شعری ہے زمیں عرشِ معلّٰی ہیں انیس — مدحتِ شاہ کا دعویٰ ہے کہ یکتا ہیں انیس
برتر از دعبل و فردوسی و مقبل ہیں انیس — نظمِ شیرازی و حسان کا حاصل ہیں انیس

عزت لکھنوی صاحب نے پورے اجتماع سے داد لی اور ایک ایک مصرعے پر سامعین جھوم اٹھے۔

ضمیر اختر صاحب نے اعلان کیا کہ یہ جلسہ جو منعقد ہوا ہے اس کے لئے رضویہ سوسائٹی میں کوئی چندہ نہیں کیا گیا اور نہ کسی سیٹھ سے رقم حاصل کی گئی ہے۔ حبیب بنک یا یونائیٹڈ بنک یا کوئی اور کمپنی یا بینک سے کوئی رقم حاصل نہیں کی گئی اور اگر کسی غیر ذمہ دار شخص نے میر انیس کے نام پر کوئی رقم کہیں سے حاصل کی ہے تو اس کی ذمہ دار "انجمن یادگارِ میر انیس" نہیں ہے۔!!

• "انجمن یادگارِ میر انیس" کا تعلق کسی ٹرسٹ سے نہیں ہے: "انجمن یادگارِ میر انیس" ہر اس ادارے کی

مدد کرتی ہے جو میر انیسؔ پر کام کرنا چاہتا ہے انجمن اس کا معاوضہ طلب نہیں کرتی۔"

جناب سید ہاشم رضا صاحب اپنا مقالہ" انیسؔ اپنے اشعار کے آئینے میں" ساتھ لائے تھے لیکن مقالات کا پروگرام نہیں رکھا گیا تھا۔ مقالات کا پروگرام صد سالہ برسی کے موقع پر رکھا جائے گا۔

جناب سید ہاشم رضا صاحب نے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ۲۹ شوال ۱۳۹۱ھ میں ہم میر انیسؔ کی صد سالہ برسی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے نہ منا سکے اور اب جب کہ سن عیسوی کے مطابق میر انیسؔ کی برسی قریب ہے ہم کو چاہیے کہ ہم خلوص کے ساتھ برسی منانے کی تیاری نہ کریں بلکہ برسی منانا شروع کر دیں۔ میر انیسؔ نے سانحۂ کربلا کو نظم کر کے اردو پر زبردست احسان کیا ہے۔" انہوں نے میر انیسؔ کے ایک دوست کا خط بھی پڑھ کر سنایا جو اہلسنت تھے۔ انہوں نے یہ خط شاد عظیم آبادی کو پٹنے لکھا تھا جس میں میر انیسؔ کے انتقال کی خبر دی گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء مطابق ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ

"...... معلوم ہوا کہ ابھی میر انیسؔ کا انتقال ہوا ہے۔ شاید ایسا باکمال پیدا نہ ہوگا۔ اس گھر سے میر انیسؔ کا گھر اتنی دور ہے جیسے آپ کے گھر سے مدرسہ، کہرام کی آواز یہاں تک آتی رہی۔ رات بھر میرے یہاں نہ کسی نے کھایا نہ کوئی سویا۔ صبح کو سارے لکھنؤ میں ماتم برپا تھا۔ شہر ویران اور بھیانک معلوم ہوتا تھا۔"

ہاشم رضا صاحب نے اپنی ایک نظم سنائی جو" ماہِ نو" کے انیسؔ نمبر میں شائع ہوئی ہے:۔

عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا انیسؔ جب تجھے دیکھا بلند تر دیکھا

نظم پیش کرنے کے بعد ہاشم رضا صاحب نے کہا کہ میر انیسؔ کا تذکرہ نامکمل ہے۔ اگر مرزا دبیرؔ کا تذکرہ نہ ہو یہ دونوں اردو شاعری کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ میر انیسؔ مرزا دبیرؔ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ مرزا دبیرؔ کا بھی یہی عالم تھا اور اس محبت کا پتہ مرزا دبیرؔ کی قطعۂ تاریخ سے چلتا ہے جو انہوں نے میر انیسؔ کی وفات پر کہی تھی۔ اگر مرزا دبیرؔ کا انتقال پہلے ہوتا تو اسی طرح میر انیسؔ بھی مرزا دبیرؔ کی تاریخ وفات نظم کرتے۔ انہوں نے کہا کہ شبلیؔ نے مرزا دبیرؔ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ہاشم رضا صاحب نے مرزا دبیرؔ کا ایک مرثیہ جو سلیس زبان میں تھا پیش کیا۔ اس مرثیے نے پورے مجمع کو گریہ پر مجبور کر دیا۔ تقریباً چالیس یا پچاس بند مسلسل ہاشم رضا صاحب نے زبانی سنائے۔

جناب ہاشم رضا صاحب کے بعد جناب ضیاء الحسن موسوی نے ایک مختصر سی تقریر میں کہا کہ یہ میرے ہاتھ میں حکومت پاکستان کا شائع کردہ" ماہِ نو" کا" انیس نمبر" ہے جس کی قیمت صرف چار روپے ہے لیکن یہ انیسؔ نمبر ۳۰ ہزار روپے کے سرمایہ سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ۳۰ ہزار حکومت پاکستان کے بیکار تھے اگر ضمیر اختر صاحب اپنے مضامین قیمتی اشارئیے اور تصاویر انفارمیشن کو نہ دیتے۔"

ان کے بعد ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اپنی تقریر میں بہت سی قیمتی باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی شاعر کے بارے

میں جدید نقطۂ نظر یہ دیکھتا ہے کہ شاعر نے کسی عظیم حقیقت کی کس پائے پر ترجمانی کی ہے۔ محض یہ کہہ دینا کہ اس کے یہاں فلاں فلاں بات نہیں ہے۔ منفی اندازِ فکر ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس نے حقیقت کی کہاں تک ترجمانی کی ہے اور کون کون سے ایسے رمزیات و اشارات پیش کئے ہیں جو ہر شخص ہر دور میں سمجھ سکے گا اور آج اگر ہم بہ نظرِ غور دیکھیں تو میر انیس کے ہاں اشاریہ نگاری بہت زیادہ نکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ انہوں نے بعض مورخین کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا سانحۂ کربلا چونکہ صرف تین چار گھنٹوں ہی میں شروع ہو کر ختم ہو گیا تھا اس لئے اس سلسلے میں بے اندازہ تفصیلات و جزئیات نگاری واقعاتی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ دیکھنا یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کیا آفاقی اہمیت رکھتا ہے بظاہر یہ واقعہ ایک چھوٹا سا نقطہ ہے مگر حقیقت میں اسی قدر اہم ہے کہ اس چھوٹے سے نقطے پر کائنات کی کیلی کھڑی ہے اگر یہ نقطہ ذرا سا ہٹ جائے تو پوری کائنات ڈھیر ہو جائے واقعہ کربلا کی وہی اہمیت ہے جسے میر انیس نے اجاگر کیا ہے اور انہوں نے اس کے لئے رمزیت و معنویت کے فن سے کما حقہ فائدہ اٹھایا۔"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی صاحب کے بعد جناب سبطِ حسن انجم نے میر انیس کا مشہور مرثیہ

ع بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حرُ . . . . تحت لفظ پیش کیا۔

جناب سبطِ حسن صاحب انجم کے بعد جناب نسیم امروہوی صاحب کو زحمت دی گئی۔ نسیم امروہوی صاحب نے ضمیر اختر کی فرمائش پر ایک پورا مرثیہ میر انیس سے متعلق لکھا تھا۔ اس مرثیے کے طویل چہرے میں میر انیس کی ادبی حیثیت اور شاعرانہ عظمت کے ذیل میں بعض ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ان کے کلام کے سرسری مطالعے میں نظر نہیں آتے۔ نیز اس امر سے بھی بحث کی گئی ہے کہ میر انیس نے کس طرح برصغیر کے دورِ انحطاط میں مسلمانوں کے مردہ جذبات اور مجاہدانہ شعور کو ۴۴

اخبارِ غم

- بیگم خواجہ حبیب علی ڈپٹی سی۔ ایس۔ ایمینجنگ ٹرسٹی پاکستان امامیہ مشن نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ مرحومہ ڈاکٹر شبر حسن اور ڈاکٹر مبشر حسن وزیر خزانہ حکومت پاکستان کی بہن تھیں۔
- سید آلِ نقی صاحب نے کراچی سے اطلاع دی ہے کہ ان کی والدہ معظمہ شدید علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔
- والدِ حجۃ الاسلام مولانا سید صفدر حسین نجفی پرنسپل جامع المنتظر لاہور نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔
- علی افضل زیدی ولد علی غضنفر زیدی (سکھر) جیپ اور سکوٹر کے تصادم میں جاں بحق ہو گئے۔
- پنجابی زبان کے مشہور شاعر اور بعض نہایت مقبول پنجابی گیتوں کے مصنف "منظور جھلا" نے وفات پائی۔
- فاروق نیازی (فرزند مولانا کوثر نیازی وزیر اطلاعات ومذہبی امور) عنفوانِ شباب میں ایک حادثہ سے دوچار ہو کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔
- ہوائی جہاز کی ٹریننگ دیتے ہوئے ۲۲ سالہ نوجوان زاہد حسین جہاز میں آگ لگ جانے سے جاں بحق تسلیم ہوئے۔ وہ سید اقبال حسین جعفری ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے نواسے اور خلیفہ سید سعادت حسین خان ٹرسٹی امامیہ مشن کے قریبی عزیز تھے۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ ان مسافرانِ عدم کو سورہ فاتحہ پڑھ کر ضرور بخشیں۔ شکریہ

ضمیر اختر نقوی

میر انیس کی صد سالہ برسی

اس عنوان کے تحت "انجمن یادگار انیس" کراچی کے فاضل سیکرٹری جناب ضمیر اختر نقوی نے میر انیس کی صد سالہ برسی کی اہمیت اور اس سے متعلق حالیہ سرگرمیوں کی کیفیت بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہے۔ انہوں نے اردو کے تمام ممتاز ادیبوں، شاعروں اور میر انیس کے عقیدت مندوں کو نام بنام پکار کر اس مہم میں شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ ان کی اس پکار میں کہیں کہیں للکار کی گھن گرج بھی پیدا ہو گئی ہے۔

اب تک میر انیس کی برسی کے سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے اس کی تفصیل اور آئندہ جو ہونا چاہئیے کے سرانجام پر زور دیا ہے۔ اور تمام چھوٹی بڑی فعالیتوں کا حیرت انگیز ریکارڈ ترتیب دیا ہے۔ یہ مضمون ان کی اور ان کے فرض شناس دوستوں اور معاونوں کی قابل قدر مساعی کا تذکرہ اور ان کی پُر خلوص آرزوؤں کا مرقع ہے بعض ضمیر صاحب موصوف کی ارسال کردہ تفاصیل

---

۴۴ از سر نو زندہ کر کے اردو شاعری کی دنیا میں ایک نئے انقلاب کی راہیں نکالیں اور وقت کی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے اس اعلیٰ مقصد میں کامیابی کے لئے فضا ہموار کر دی۔ نسیم صاحب نے یہ مرثیہ "پیام انس ہے انساں کو داستانِ انیس" گذشتہ سے پیوستہ سال جامعہ امامیہ کی مجلس میں پڑھا تھا۔

نسیم صاحب مرثیہ لائے تھے لیکن انہوں نے پڑھا نہیں اس لئے کہ جلسہ مسلسل چار گھنٹے سے جاری تھا۔ اس لئے نسیم صاحب نے اسی وقت صرف ایک بند نظم کر کے پیش کیا وہ ایک بند میر انیس اور مرزا دبیر دونوں کی مدح میں تھا۔ ملاحظہ ہو:

انیس کون - خدیوِ سخن خدائے سخن دبیر، شاہِ سخن، خالق بنائے سخن
انہی کے جسم پہ موزوں تھی لبِ قبائے سخن چراغ دو تھے مگر ایک تھی ضیائے سخن
نشانہ ایک تھا گو مختلف کمانیں تھیں
کہ ذوالفقار کی گویا یہ دو زبانیں تھیں

سب سے آخر میں جناب اصغر حسین صاحب فرزند بابو صاحب فائق (خانوادۂ میر انیس) نے میر انیس کا مرثیہ پیش کیا۔ چونکہ دلی اور لکھنؤ کا قاعدہ ہے کہ استاد زادے کا ادب کرتے ہیں اور ان سے سب سے آخر میں پڑھوایا جاتا ہے چنانچہ جناب اصغر حسین صاحب نے جلوہِ انیس "کے اختتام پر میر انیس کا مشہور مرثیہ پیش کیا ع۔ "جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہوا"

آخر میں ضمیر اختر صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اعلان کیا کہ انشاء اللہ ہر سال اسی شان سے "یوم میر انیس" منایا جائے گا اور اب ہمیشہ تین نشستوں میں یہ جلسہ ہو گا۔ یہ جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ شرکت کرنے والے دور دور سے آئے تھے۔ حیدر آباد، میرپور، خیرپور کے حضرات بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

اسی شمارہ میں سب کم و کاست شائع کی جا سکتیں اور تلخیص کی نوبت نہ آتی۔

ضمیر اختر صاحب نے برسی منانے کی تمام کوششوں کو سراہا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کو ان کے مقالوں اور نظموں کی دل کھول کر داد دی ہے۔ اور "انیس نمبر" شائع کرنے پر ماہِ نو، بیپ، نگار، ارشاد، اردو ڈائجسٹ اور روزنامہ جنگ کے اداروں کو ہدیۂ مبارک باد پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لاہور کے مجلات نقوش، ادبِ لطیف، صحیفہ، فنون، اوراق وغیرہ آسانی سے انیس نمبر نکال سکتے ہیں۔ کراچی کے افکار، قومی زبان، سہ ماہی اردو، سہ ماہی العلم، مہر نیم روز، فاران اور اردو نامہ کو بھی انیس نمبر شائع کرنا چاہیئے۔ حکیم سعید، شام ہمدرد میں شامِ انیس منعقد کریں۔ شفیق خواجہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے اور مرزا ظفر الحسن ادارۂ یادگارِ غالب کی جانب سے میر انیس کی حیات اور فن پر کتابیں شائع کریں۔ بعض رسائل و جرائد کی کم التفاتی یا فرض ناشناسی پر حرف گیری بھی کی ہے۔ اور واشگاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اگر قمری حساب سے برسی منانے کی تاریخ (۱۵ شوال ۱۲۹۱ھ) گزر گئی تو شمسی حساب سے برسی کی تاریخ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ء) تو ہمارے سامنے ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی کی طرح میر انیس کی صد سالہ برسی بھی سنہ عیسوی کے حساب سے منائی جائے اور اپنے اس محسنِ ملت کے عدیم النظیر قومی، ادبی اور دینی کارنامے کو یاد دلانے کے لئے تقریبات کا سلسلہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ء تک جاری رہے۔

ضمیر اختر صاحب نے "انجمن یادگار انیس" کی اہتمام بالشان سعی کا ذکر بھی کیا ہے کہ "انیس نمبر" شائع کرنے والے اداروں کو تصاویر اور مضامین بلا معاوضہ فراہم کئے گئے۔ انہوں نے صدرِ مملکت ذوالفقار علی بھٹو کو بھی توجہ دلائی ہے کہ وہ میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر شاعرِ اعظم میر انیس کے حق کو فراموش نہ کریں جناب ضمیر اختر کے مضمون کا آخری حصہ یہ ہے:۔

میر انیس کی صد سالہ برسی پر گذارش

کراچی کے اہلِ قلم، دانشور اور شعراء حضرات ——— سید آلِ رضا، سید ہاشم رضا، زیڈ۔ اے بخاری، مجنوں گورکھپوری، محمود اکبرآبادی، شان الحق حقی، نسیم امروہوی، ڈاکٹر یاور عباس، شاہد نقوی، اعجاز جونپوری، اکرام جونپوری، ضیاء الحسن موسوی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر ممتاز حسین، مشفق خواجہ، سید امیر امام حر، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر محمود حسین (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)، فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر حنیف فوق، حسن اختر، منتظر کاظمی، سید یوسف حسین (آلِ میر انیس) سید اصغر حسین (فرزند بابو صاحب فائق)، عزت لکھنوی، سید محمد جعفری، رئیس امروہوی، ماہر القادری، احسن مثنیٰ ندوی، خواجہ حمید الدین شاہد، سید الطاف حسین بریلوی، سید مصطفےٰ علی بریلوی، مرزا ظفر الحسن، صہبا لکھنوی، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، حکیم سعید، ڈاکٹر عالیہ امام، منور حسین ایڈووکیٹ، علامہ رشید ترابی، اختر حسین! آپ لوگ متحد ہو کر میر انیس کی صد سالہ برسی منانے کا عزم کریں اور کام شروع کر دیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ ——— پروفیسر احتشام حسین لکھنؤ اور الہ آباد میں میر انیس کی برسی منانے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن کام ادھورا چھوڑ کر خدا کو پیارے ہو گئے۔ خواجہ غلام السیدین دلی میں میر انیس کی برسی منانے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن اچانک انتقال ہو گیا۔ صابر لدھیانوی مجھ سے فرماتے تھے میں جلدی ہی تیاری شروع کر دوں گا۔ لیکن مرحوم نے کچھ نہ کیا اور خدا کو پیارے ہوئے خدا آپ کو زندہ سلامت رکھے۔ (آمین)

لاہور کے اہل قلم، دانشور اور شعراء حضرات ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، پروفیسر وقار عظیم، احسان دانش، پروفیسر سلیم اختر، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، احمد ندیم قاسمی، احمد نقوی، کسریٰ منہاس، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر یوسف جمال، حفیظ جالندھری، ناصر زیدی، وغیرہ آپ حضرات بھی متحد ہو کر کچھ کریں۔ میر انیس کی روح سے آپ لوگ شرمندہ کیوں رہنا چاہتے ہیں۔

اے! دارالحکومت اسلام آباد اور راولپنڈی والو۔۔۔ جاگو۔۔۔!!

جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، ڈاکٹر صفدر حسین، ضمیر جعفری، پروفیسر سید حیدر دانش، فتح محمد ملک، احمد فراز، خاطر غزنوی، آغا سکندر مہدی، ابھی کام ختم نہیں ہوا۔۔۔ میر انیس ایک ایسی دنیا ہے جواب تک دریافت نہیں ہوئی۔

جن حضرات کے نام نہیں لئے گئے وہ بھی میر انیس کے لئے مجاہد بن کر کام کریں۔

ہم کیا کریں اس میں شک نہیں کہ میر انیس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے بعد جتنے شعراء اور شاعری کی بزم میں باریاب ہوئے ہیں۔ ان سب نے میر انیس کی شاعرانہ عظمت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ میر انیس پر گزشتہ سو سال میں جو کچھ کام ہوا ہے اس کو یکجا کیا جائے۔ اس کا ایک جامع انتخاب شائع کیا جائے نیز ماضی کی تحریروں کی روشنی میں میر انیس کی شاعرانہ عظمت اور بحیثیت ایک منفرد صنف سخن خود مرثیے کا از سر نو جائزہ لیا جائے کسی شاعر یا ادیب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ اس کا کلام اور اس کی تحریریں چھاپ کر کے ارزاں قیمت پر فروخت کی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی فکر سے مستفید ہو سکیں۔

میر انیس کے ضمن میں اس قسم کا کام بہت ضروری ہے۔ ان کے مراثی چھ جلدوں میں متعدد نسخوں کی صورت میں منظر عام پر آئے۔ لیکن ان کی قیمت اس قدر زیادہ تھی کہ عام طالب علم یا شہری انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موقع پر میر انیس کے کلام کا ایک جامع انتخاب الگ شائع کیا جائے اور ان کا کلیات صحت و استناد کے ساتھ دوبارہ مرتب کیا جائے مرثیہ گوئی کی تاریخ میں جن شعراء نے نام پیدا کیا ہے ان پر کتابیں یا مضامین اور ان کے کلام کا انتخاب مرتب کیا جائے۔ نیز میر انیس کے اہل خاندان اور ان کے ہمعصروں کے حالات، واقعات اور کلام پر کتابیں لکھی جائیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ضروری ہے کہ کسی تہذیب اور کسی ادب کی عظمت کو برقرار رکھنے اور ہر آنے والی نسل کو اس کی خوبیوں سے آگاہ کرنے کے لئے دوسری ترقی یافتہ اقوام انہی خطوط پر کام کر رہی ہیں۔ "فرہنگ انیس" کی ضرورت بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ تمام کام بہت آسان ہے اور ہر شہر میں ہو سکتا ہے۔ میر انیس کی جودت فکر، فصاحت سخن اور بلاغتِ کلام تک رسائی رکھنے والے ناقدین اور اربابِ نظر کا ایک دوسرے سے تعاون اس سلسلے میں بہت ضروری ہے۔

یوم انیس، شامِ انیس، جشنِ انیس جلسے بھی جگہ جگہ ہونا چاہئیں۔ خواہ کوئی یوم انیس منعقد کرے یا شام انیس، اعلیٰ پیمانے پر جشنِ انیس بھی منایا جائے۔

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ کی چند نادر کتب

کلام انیس — خدائے سخن میر انیس کے بے نظیر کلام کا حسین انتخاب ہے۔ جس میں مختلف مرثیوں کے ذریعے رخصت مدینہ سے شہادت امام مظلوم تک تمام واقعہ کربلا کو سلسلہ وار پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں مولانا الحاج سید مرتضیٰ حسین صاحب صدر الافاضل اور پروفیسر سید عابد علی عابد کے دو گراں قدر مقدمات بھی ہیں۔ جن میں شعر و ادب و مرثیہ پر گفتگو ہے۔

مجلد ۳۰۴ صفحات سہ رنگا ڈسٹ کور کتابت و طباعت عمدہ قیمت = 3/60

شہید انسانیت — از افادات مفکر اسلام سید العلماء الحاج علامہ علی نقی ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی علی گڑھ یونیورسٹی، فخر انسانیت محسن کے قابل ناز نواسہ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ اور واقعہ کربلا پر اس صدی کی بہترین کتاب جو تیرہ سو سالہ یادگار حسینی کے عالمگیر مصوبہ کا قابل فخر شاہکار ہے۔ مشرق و مغرب میں اس کی دھوم ہے۔

نفیس مضبوط سنہری ڈیزائن جلد، ۷۰۰ صفحات سفید کاغذ آفسٹ طباعت قیمت ۱۵ روپے

زندگی کا حکیمانہ تصور — زندگی کیا ہے، انسان کی حقیقت، مذاہب عالم اور انسانی ترقی، اسلام کی علمی تعلیمات، اسلام اور حریت، انفرادی اور اجتماعی زندگی، دین و دنیا، عبادت کا صحیح مفہوم، اجتماعی زندگی، سیاست مدن جیسے ۱۷ موضوعات بصیرت افروز مقالات جس میں اسلام کے اصول اور تعلیمات شریعت کو جناب سید العلماء الحاج علامہ علی نقی مجتہد العصر نے دلنشیں انداز سے رقم فرمایا ہے۔

۱۳۰ صفحات مجلد چہار رنگا دلآویز ڈسٹ کور سفید کاغذ کتابت و طباعت نفیس قیمت = 2/50

شہید اعظم — امام حسینؑ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے جو نقطۂ خیالی فوق البشر سے عظیم تر ہمارے تصورات سے کہیں بلند اور کامل شخصیت پر ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی پی ایچ ڈی کا بلند پایہ کارنامہ جو قاری کے خون کو گرمانے کا ضامن ہے۔

۲۷۴ صفحات مجلد سہ رنگا ڈسٹ کور سفید کاغذ کتابت و طباعت دلنواز قیمت = 3/75

کربلا کی شیر دل خاتون — شجیع عالم، شیر کردگار علی مرتضیٰؑ کی بیٹی حضرت زینبؑ کے سوانح حیات۔ وہی زینبؑ جس نے شام کے بھرے دربار میں اپنی سیرت کی عظمت اور خاندانی شجاعت سے یزید کو دنیا میں رسوا کر کے اسلام کی عظمت و صداقت کا پرچم لہرا دیا۔ یہ قابل قدر کتاب ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی مصری کی تصنیف ہے۔ جس کو خان بہادر سید محمد عباس صاحب جلالوی نے اردو کا لباس پہنایا۔

مضبوط جلد ۳۲۳ صفحات سفید کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ،

قیمت = 3/75

ملنے کا پتہ: مکتبہ امامیہ مشن ۱۷۔ انارکلی، پوسٹ بکس ۴۸۵ لاہور

صوفی محمد احمد صاحب پبلشر نے تعلیمی پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر پیام عمل ۱۷ انارکلی لاہور سے شائع کیا۔



میر ضاحک (میر حسن کے والد)



دولہا صاحب عروج (میر انیس کے پوتے)



للن صاحب فائز (دولہا صاحب عروج کے فرزند)



ضمیر اختر نقوی (سیکرٹری) تقریر کر رہے ہیں

ماہنامہ پیام عمل لاہور

انیس نمبر



مزار میر انیس

ٹائیٹل : سلمان آرٹ پریس ۔ لاہور